... Science Magazine is being published to popularise Science. This Magazine also contains articles of scholars from other Vishwavidyalayas. The Vedic Path and the Prahlad were being published in English and Hindi respectively. These magazines contain research material for students of Vedic Literature, Religion, Philosophy, Culture and Ancient Indian History, etc. From this year, a Science Research Magazine is going to be published; it is believed that it will gain international repute right from the beginning.

THE GURUKULA PATRIKA - is the oldest magazine of this Vishwavidyalaya; it highlights the original values of Gurukula. Besides scholars, persons who have faith in Arya Samaj, are the varacious readers of this magazine.

Publication grants were sanctioned to the following teachers ...

ت

پریم چند

تیرتھ رام اینڈ سنز تاجران کتب چوک انارکلی لاہور

آدمیوں نے حصّے خریدنے کے وعدے کئے۔ لیکن نہ حصّے بکے نہ کمپنی کھڑی ہوئی۔ ہاں اُسی دُھن میں گوروپرشاد نے ایک ناٹک ضرور تصنیف کر ڈالا اور یہ فکر ہوئی۔ کہ اِسے کسی کمپنی کو دیا جائے۔ لیکن یہ تو معلوم ہی تھا۔ کہ کمپنی والے ایک ہی گھاگھ ہوتے ہیں۔ پھر ہر ایک کمپنی میں اس کا ایک ڈرامہ نویس بھی ہوتا ہے بھلا وہ کب گوارا کریگا۔ کہ اِس کی کمپنی میں کسی غیر شخص کا داخلہ ہو۔ وہ اِس تصنیف میں طرح طرح کے عیب نکالیگا۔ اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دیگا۔ بالآخر یہ ترکیب سوچی گئی۔ کہ احباب کمپنی کے مالکوں پر کچھ ایسا رُعب غالب کریں۔ کہ کمپنی کے ڈرامیٹسٹ کی دال گل ہی نہ سکے۔ چنانچہ پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس میں تمام پروگرام پر تبادلہ خیالات ہُوا۔ اور دُوسرے دن گوروپرشاد جی معہ اپنے رُفقا کے ناٹک دکھانے چلے۔ ٹمٹمگے آ گئے۔ ہارمونیم طبلہ وغیرہ سب ان پر لاد دئے گئے۔ کیونکہ ناٹک کے Demonstration کا فیصلہ ہو گیا تھا۔

یکایک ونود بہاری نے کہا۔ "یار ٹمٹمگے پر جاتے ہیں تو کچھ بدزیبی سی ہوگی۔ مالک سوچیگا۔ یہ مہاشے تو یوُں ہی ہیں۔ اِس وقت دس پانچ روپیہ کا مُنہ نہ دیکھنا چاہیئے۔ میں تو مغربی اشتہار بازی کا قائل ہوں۔ کہ روپے میں پندرہ آنے اسی میں لگا کر صرف ایک آنہ میں تجارت کرتے ہیں۔ کہیں سے دو موٹریں منگانی چاہئیں۔

رسک لال نے کہا۔ لیکن کرایہ کی موٹروں سے یہ بات پیدا نہ ہوگی۔ جو آپ چاہتے ہیں کسی رئیس سے دو موٹریں مانگ لینی چاہئیں۔ ماربن ہوں یا نئے فیشن کی آسٹن۔

بات سچی تھی۔ بھیس سے بھیک ملتی ہے۔ قیاس آرائیاں ہونے لگیں کس رئیس سے درخواست کی جائے۔ اجی وہ مہا کھوسٹ ہے۔ سبح صبح اُس کا

نام لے لو۔ تو دن بھر پانی نہ ملے۔ اچھا سیٹھ جی کے پاس چلیں تو کیسا؟ منہ دھو رکھئے۔ اس کی موٹریں افسروں کے لئے ریزرو ہیں۔ اپنے لڑکے تک کو کبھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ آپ کو دیئے دیتا ہے۔ تو چلو کپور صاحب کے پاس چلیں۔ ابھی اُنہوں نے نئی موٹر لی ہے۔ اجی اس کا نام مت لو۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیگا۔ ڈرائیور نہیں ہے۔ زیر مرمت ہے۔ اِس قسم کی باتیں بناتے اُسے کیا دیر لگتی ہے۔

گورو پرشاد نے مایوس ہو کر کہا۔ تم لوگوں نے خواہ مخواہ بکھیڑا کر دیا۔ ٹانگوں پر چلنے میں کیا حرج تھا۔

ونود بہاری نے کہا۔ آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا۔ دوسری بات ہے۔ اور معاملہ کرنا دوسری بات ہے۔ ---------- میری بات سنئے۔ فی صفحہ ایک روپیہ سنا دیگا۔ اپنا سا مُنہ لے کر رہ جائیگا۔

امرناتھ نے کہا۔ میں سمجھتا ہوں۔ موٹر کے لئے کسی راجہ رئیس کی خوشامد کرنا بیکار ہے۔ تعریف تو جب ہے۔ کہ پیدل چلیں۔ اور وہاں ایسا رنگ جمائیں۔ کہ موٹر سے زیادہ شان جم جائے۔

ونود بہاری اُچھل پڑے۔ سب لوگ پیدل چلے۔ وہاں پہنچکر کس طرح باتیں شروع ہوں۔ کس طرح تعریفوں کے پُل باندھے جائیں۔ کس طرح ڈرامیٹ صاحب کو خوش کیا جائے۔ تمام راستہ اسی پر گفتگو اور بحث کا بازار گرم رہا۔

آخر یہ لوگ کمپنی کے کیمپ میں پہنچے۔ تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ پروپرائیٹر صاحب معہ اپنے ایکٹرز اور ڈرامیٹسٹ کے پہلے ہی سے ہمارے اِنتظار میں تھے۔ پان الائچی سگریٹ وغیرہ پہلے ہی سے منگوائے گئے تھے۔

اوپر جاتے ہی رسک لال نے مالک سے کہا۔ معاف فرمائیے گا۔ ہم

لوگوں کو یہاں پہنچنے میں کسی قدر دیر ہوئی۔ موٹر سے نہیں بلکہ پا پیادہ آئے ہیں۔
سب لوگوں کی یہی صلاح ہوئی۔ کہ آج قدرتی مناظر کا لطف اُٹھاتے ہوئے
چلیں۔ گورو پرشاد جی تو قدرت کے پرستاروں میں سے ہیں۔ اگر ان کا بس چلتا
ہو۔ تو آج چمٹا لیئے ہوئے یا تو کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔ خواہ کسی پہاڑ کی کھوہ
میں یا گاؤں میں کسی برگد کے سایہ میں بیٹھے ہوئے خوش نوا پرندوں کے وجد انگیز
نغموں سے محظوظ ہوتے۔

ونود نے رِدا اور آئے بھی تو سیدھے راستہ سے نہیں۔ نہ معلوم
کہاں کہاں کا چکر کاٹتے خاک چھانتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے۔ جیسے پاؤں میں سنیچر ہے۔

امرت نے کچھ اور ہی رنگ جمایا۔ پورے ست جگی آدمی ہیں۔ نوکر چاکر
تو موٹروں پر سیر کرتے ہیں۔ اور آپ گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ جب
اور رئیس خواب راحت کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ تو آپ ندی کے کنارے
اُوشا کی چھایا نمائیوں میں محو رہتے ہیں۔ مرت رام نے فرمایا۔ شاعر ہونے کے
معنے دین و دنیا سے بیگانہ ہو جانا ہے۔ گلاب کی ایک پنکھڑی لیکر اس میں نہ
معلوم گھنٹوں کیا دیکھا کرتے ہیں۔ قدرت کے مشاہدے سے ہی یوروپ کے
بڑے بڑے شعرا کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ کاش یہ یوروپ میں ہوتے۔ تو ان
کے دروازے پر ہاتھی جھومتا ہوتا۔ ایک دن ایک لڑکے کو روتے دیکھ کر آپ
رونے لگے۔ ہر چند پوچھتا ہوں۔ بھئی کیوں روتے ہو؟ مگر جواب نہیں دیتے۔
بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل
سے آواز نکلی!

ونود۔ جناب؛ شاعر کا دل نازک اور لطیف جذبات کا سرچشمہ ہے

نغمۂ لطیف کی کان ہے۔ وُسعت کا آئینہ ہے۔" واہ واہ آپ نے کیا بات کہی؟ "وُسعت کا آئینہ"، واہ! شاعر کی صحبت میں رہ کر آپ پر بھی شاعری کا رنگ غالب آتا جا رہا ہے۔

گورو پرشاد۔ نے عاجزانہ انداز سے کہا"۔ میں شاعر نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے شاعری کا دعویٰ ہے۔ آپ لوگ مجھے زبردستی شاعر بنائے دیتے ہیں۔ شاعر قدرت کی وہ عجیب و غریب تخلیق ہے۔ جو عناصرِ خمسہ کی جگہ نو رسوں سے ترکیب پاتی ہے۔

مست رام۔ آپ کی یہی ایک بات ایسی ہے۔ جس پر سینکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ رسک لال جی! شاعر کی عظمت ذہن نشین ہوئی یا نہیں۔ یاد کر لیجئے رٹ لیجئے۔

رسک لال۔ کہاں تک یاد کروں؟ یہ تو تشبیہات اور استعارات میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور انکساری کا یہ حال ہے۔ کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں قابلیت و ذہانت کی یہی علامت ہے۔ جس نے اپنے آپ کو کچھ سمجھا بس وہ رہ گیا (کمپنی کے مالک سے) آپ تو سب کچھ خود ہی سُن لینگے۔ اِس ڈرامہ میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاعروں میں جو عام طور پر ایک خود نمائی ہوتی ہے۔ اس کی آپ میں کہیں بُو بھی نہیں۔ اِس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے میں آپ نے کچھ نہیں۔ تو کم از کم ایک ہزار بڑے بڑے پوتھوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ واجد علیشاہ کو خود غرض وقائع نگاروں نے کتنا بدنام کیا ہے۔ آپ سے یہ پوشیدہ نہیں اِس طومار میں سے حقیقت کا انتخاب کرنا آپ ہی کا کام ہے۔

دنود۔ اِسی لئے ہم اور آپ دونوں کلکتے گئے۔ اور وہاں متواتر چھ ماہ تک مٹیا بُرج کی خاک چھانتے رہے۔ واجد علیشاہ کا قلمی مسودہ تلاش کیا۔ اِس

ڈرامہ کی تکمیل کے لئے اِس کتاب کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ اس میں انہوں نے خود ہی اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ ایک بڑھیا کو بہت کچھ نذر کرنے پر چھ مہینے میں جاکر کتاب ملی ہے۔

امرناتھ۔ کتاب نہیں۔ جواہرات کی کان ہے۔

مست رام۔ اِس وقت تو اس کی حالت کوئلے کی سی تھی۔ گوروپرشاد جی نے اس پر مُہر لگا کر اشرفی بنادیا۔ ڈرامہ ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ جو سُنے دل ہاتھوں سے تھام لے۔ ایک ایک نُکتہ دل میں تیر و نشتر کی طرح اتر جائے۔

امرناتھ۔ لٹریچر کے تمام ناٹکوں کو آپ نے چاٹ ڈالا۔ اور فن ڈرامہ پر سینکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔

ونود۔ جب ہی تو چیز بھی لاثانی ہوئی ہے۔

امرناتھ لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا۔ پیروں پڑا کہ یہ ناٹک مجھے دیجئے۔ لیکن آپ نے نہ دیا۔ نہ دیا۔ جب ایکٹر ہی اچھے نہیں۔ تو ان سے اپنا ڈرامہ کھلوانا۔ اس کی مٹی خراب کرنا تھا۔ اِس کمپنی کے ایکٹر ماشاءاللہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور اِس کے ڈرامہ نویس کی سارے زمانہ میں دھوم ہے آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ ڈرامہ دھوم مچا دیگا۔

ونود۔ ایک تو مُصنف صاحب بذاتِ خود شیطان سے زیادہ مشہور ہیں اِس پر ایکٹروں کا اسلوب ساز و سامان، یہ تمام باتیں ملکر قیامت برپا کر دینگی۔

مست رام روز ہی تو کسی نہ کسی کمپنی کا آدمی سر پر سوار رہتا ہے۔ مگر بابو صاحب کسی سے سیدھے مُنہ بات ہی نہیں کرتے۔

ونود۔ بس ایک یہ کمپنی ہے۔ جس کے تماشہ کے لئے دل بیقرار رہتا ہے، نہیں تو اور جتنے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔۔

دو کوڑی کے۔ میں نے تو تماشہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔

گورو پرشاد۔ ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ خونِ جگر پینا پڑتا ہے
میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لئے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں۔
بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جاتا ہے۔ یوں قلم گھسنا دوسری بات ہے
بڑے بڑے زبردست مُبصرین کا یہی فیصلہ ہے۔ کہ ڈرامہ زندگی میں صرف ایک
ہی لکھا جا سکتا ہے۔ روس۔ فرانس۔ جرمنی تمام زبان کے ڈرامے پڑھے۔ مگر کوئی
نہ کوئی نُقص ہر ایک میں موجود ہے۔ کسی میں جذبات ہیں۔ تو زبان نہیں۔ زبان
ہے۔ تو جذبات نہیں۔ مذاق ہے۔ تو گانا نہیں۔ گانا ہے تو مذاق نہیں۔ جب
جب تک جذبات۔ زبان۔ مذاق اور گانا یہ چاروں باتیں پورے طور پر موجود
نہ ہوں۔ اسے ڈرامہ کہنا ہی غلطی ہے۔ میں تو نہایت ہی ناقابل شخص ہوں، آپ
لوگوں کی صحبت میں کچھ شُدبُد کر لیتا ہوں۔ میری تصنیف کی حقیقت ہی کیا۔ لیکن
اگر پرماتمانے چاہا۔ تو اس ڈرامہ میں ایسے نقائص آپ کو نہ ملینگے،

دِنود۔ جب آپ کی قابلیت کا یہ حال ہے۔ تو نقائص رہ ہی کیسے سکتے
ہیں۔

رسک لال۔ دس سال تک آپ نے صرف فنِ نغمہ کی ہی مشاقی کی ہے
ہزاروں روپے اُستادوں کی۔۔ نذر کر دیئے۔ اگر اتنے پر بھی نقص رہ جائے۔ تو بدقسمتی

ریہرسل

ریہرسل شروع ہوئی۔ اور واہ واہ اور ہائے ہائے کا تار بندھا۔
کورس سُنتے ہی ایکٹر پروپرائیٹر اور ناٹک نویس جیسے کسی خوابِ گراں سے

بیدار ہو اُٹھے۔ ہتھیار نے اُنہیں زیادہ مُؤثر نہیں کیا تھا۔ لیکن اصلی چیز سامنے آتے ہی آنکھیں کھلیں۔ سماں بندھ گیا۔ پہلا سین آیا۔ آنکھوں کے سامنے واجد علیشاہ کے دربار کی تصویر کھنچ گئی۔ درباریوں کی حاضر جوابی اور پھڑکتے ہُوئے لطیفے! واہ واکیا کہنا ہے۔ کیا طرزِ ادا تھی۔ اور کیا شوکت الفاظ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے تمام رس ایک ہی جگہ پر مجتمع ہوکر اپنی کیفیت دکھا رہے ہیں۔ تیسرا نظارہ مذاقیہ تھا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دکھنے لگیں۔ چوتھا سین نہایت رنجدہ اور تڑپا دینے والا تھا۔ مذاق کے بعد افسردگی۔ آندھی کے بعد آنے والا سکون تھا۔ ونود۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے جیسے رو رہے تھے۔ مست رام بار بار ٹھنڈی آہیں کھینچ رہے تھے۔ اور امرناتھ پیہم سسکیاں بھر رہے تھے۔ اِسی طرح سین پر سین اور باب پر باب ختم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جب ری ہرسل ختم ہُوا۔ تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔

سیٹھ جی۔ اب تک سونٹھ بنے بیٹھے رہے۔ ڈرامہ ختم ہو گیا۔ لیکن ان کی زبان پر ان کی مُبارک رائے کے عکس کا شائبہ تک نہ تھا۔ جڑ بھرت کی طرح بیٹھے ہُوئے تھے۔ نہ مسکراہٹ تھی۔ نہ داد۔ نہ اشک نہ کچھ۔ آخر ونود بہاری نے معاملے کی بات پوچھی" تو اِس ڈرامہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

سیٹھ جی نے اِسی بے نیازانہ انداز میں جواب دیا۔ اِس کے متعلق کل عرض کرونگا۔ کل یہیں کھانا بھی کھائیے گا۔ آپ لوگوں کے لائق کھانا تو کیا ہو سکیگا۔ اِسے صرف وِدر کا ساگ سمجھ کر قبول فرمائیے۔

جیسے ہی پانڈو باہر نکلے۔ مارے خوشی کے سب کی باچھیں کھلی جاتی تھیں ونود۔" پانچہزار کی تھیلی ہے۔ ناک ناک بدسکتا ہوں"۔

امرناتھ:۔ پانچہزار ہے۔ کہ دس یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن رنگ خوب جما"

رسک لال "میرا اندازہ تو چار ہزار تک ہے"۔

مست رام "میرا یقین تو یہ ہے۔ کہ دس ہزار سے کم کہیگا ہی نہیں۔ میں تو سیٹھ کے چہرے کی طرف یکسوئی سے دیکھ رہا تھا۔ آج ہی کہہ دیتا۔ لیکن ڈرتا تھا کہیں یہ لوگ نامنظور نہ کر دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر تو ہنسی نہ تھی۔ لیکن مست خوب ہو رہا تھا"۔

گورو پرشاد۔ "میں نے پڑھا بھی تو جی توڑ کر"

ونود۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آپ کے گلے میں سرسوتی بیٹھ گئی ہو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔

رسک لال۔ مجھے اس کی خاموشی سے ذرا اشتباہ ہوتا ہے"۔

امر۔ ڈرامیسٹ بھی خوب خوش ہو رہا تھا دس بارہ ہزار کا وارا نیارا ہے۔ بھئی آج اس خوشی میں دعوت ہونی چاہیئے۔

گورو پرشاد۔ ارے تو کچھ ہی پٹا تو ہو جائے"۔

مست۔ "جی نہیں تب تو جلسہ ہوگا۔ آج دعوت ہوگی"۔

ونود۔ "ہو تو تم خوش قسمت"

رسک لال۔ "میری رائے میں تو اس ڈرامیسٹ کو گانٹھ لیا جائے۔ اس کی خاموشی مجھے خوف زدہ کر رہی ہے"

مست۔ "آپ کو تو خفقان ہو گیا ہے۔ وہ ناک رگڑ کر رہ جائے۔ تب بھی یہ سودا ہو کر ہی رہیگا۔ سیٹھ جی اب بچکر نکل نہیں سکتے"

ونود۔ ہم لوگوں کی تمہید بھی ذمہ دار تھی۔

امر۔ اسی نے تو رنگ جما دیا۔ اب کوئی چھوٹی رقم کہنے کا اسے حوصلہ ہی نہ ہوگا

تماشہ

رات کو گوروپرشاد کے گھر دوستوں کی دعوت ہوئی۔ دُوسرے دن چھ بجے پانچوں آدمی سیٹھ جی کے پاس جا پہنچے۔ شام کا وقت ہوا خواری کا تھا۔ آج موٹر پر نہ آنے کے لئے بنا بنایا بہانہ تھا۔ سیٹھ جی آج بیحد خوش نظر آتے تھے۔ کل کی وہ محرمی صورت غائب ہو گئی تھی۔ بات بات پر چہکتے تھے۔ ہنستے تھے۔ فقرے کستے تھے۔ جیسے لکھنؤ کا کوئی رئیس ہو۔ دعوت کا سامان تیار تھا۔ میز پر کھانا چنا جانے لگا۔ انگور، سنگترے، کیلے، خشک میوے، مختلف قسم کی مٹھائیاں کئی طرح کے مربّے شراب وغیرہ سجائے گئے۔ اور یاروں نے خوب مزے سے دعوت کھائی۔ سیٹھ جی مہمان نوازی کے پتلے بنے ہوئے ہر ایک مہمان کے پاس آ آکر پوچھتے۔ کچھ اور منگواؤں؟ کچھ تو اور لیجئے۔ آپ لوگوں کے لائق کھانا یہاں کہاں بن سکتا ہے۔

کھانے کے بعد لوگ بیٹھے تو معاملہ کی بات چیت ہونے لگی۔ گوروپرشاد کا دل اُمیّد و بیم سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

سیٹھ جی۔ حضور نے نہایت بلند پایہ ڈرامہ لکھا ہے۔ کیا بات ہے۔

ڈرامٹیسٹ۔ یہاں کی پبلک اچھے ڈرامہ کی قدر نہیں کرتی۔ ورنہ یہ ڈرامہ لاجواب ہوتا۔

سیٹھ جی۔ پبلک قدر نہیں کرتی۔ نہ کرے۔ ہمیں اِس کی بالکل پرواہ نہیں ہے، رتی بھر پرواہ نہیں ہے۔ میں تو اس کی تیاری میں صرف پچاس ہزار بابو صاحب کی خاطر خرچ کر دونگا۔ آپ نے جب اتنی محنت سے ایک چیز لکھی ہے۔ تو میں اِس کی اشاعت بھی اسی حوصلہ سے کرونگا۔ ہمارے لئے کیا یہ کم خوش قسمتی

ہے کہ آپ جیسے معزز اصحاب اس میدان میں اُتر آئے۔ یہ تماشہ حضور کو زندہ جاوید بنا دیگا۔

ڈرامیٹسٹ۔ میں نے ایسا ڈرامہ آج تک نہیں دیکھا۔ لکھتا میں بھی ہوں۔ اور لوگ بھی لکھتے ہیں۔ لیکن آپ کی پرواز تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ کہیں کہیں تو آپ نے شکسپیئر کو بھی مات کر دیا ہے:۔

سیٹھ جی۔ ہاں جناب جو چیز دل کی اُمنگ سے لکھی جاتی ہے۔ وہ ایسی ہی اچھوتی اور لاجواب ہوتی ہے۔ شکسپیئر نے جو کچھ لکھا۔ وہ روپیہ کے لالچ سے لکھا۔ ہمارے دوسرے ڈرامہ نویس بھی دولت کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ اِن میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ جو بے غرضانہ لکھنے والوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ گوسائیں جی کی رامائن کیوں زندہ ہے۔ اِس لئے کہ وہ بھگتی اور پریم سے مُتاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ سعدی کی گلستاں بوستاں، ہومر کی تصنیفات اِس لئے مقبول عام ہیں۔ کہ ان لوگوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے۔ جو امنگ سے لکھتا ہے۔ وہ ایک ایک لفظ، ایک جُملہ، اور ایک ایک ترکیب پر مہینوں کاوش کرتا ہے۔ مگر بندۂ دولت کو تو ایک کام ختم کرکے دُوسرے کو شروع کرنے کا فکر ہوتا ہے۔

ڈرامیٹسٹ:۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہمارے ادب کی تنزلی کا باعث بھی یہی ہے۔ کہ ہم دولت کی غرض یا ناموری کے لئے لکھتے ہیں۔

سیٹھ جی:۔ سوچئے آپ نے دس ہزار صرف فنِ موسیقی کی تحصیل میں خرچ کر دئے۔ لاکھوں روپے گویّوں اور اہل ہُنر کی نذر کر دئے۔ کہاں کہاں سے اور کتنی جد و جُہد سے اس ناٹک کا مصالحہ مجتمع کیا۔ نہ جانے کتنے والیانِ ریاست کو سنایا۔ اِس جد و جہد اور جانفشانی کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے۔

ڈرامیٹسٹ ”ممکن ہی نہیں۔ ایسی تصانیف کے معاوضہ کا تصور کرنا ہی اُن کی توہین کرنا ہے، اُن کا معاوضہ اگر کچھ ہے۔ تو وہ اپنی رُوح کی تشفی ہے اور وہ قناعت جو آپ کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔

سیٹھ جی۔ ”آپ نے سچ کہا۔ کہ ایسی تصانیف کا معاوضہ تسکین رُوح ہے۔ معاوضہ تو ایسی تصانیف کو بھی مل جاتا ہے۔ جو صحافت پر بدنما داغ ہیں۔ آپ ڈرامہ لے لیجئے۔ اور آج ہی پارٹ بھی تقسیم کر دیجئے۔ تین مہینے کے اندر اُسے کھیل ڈالنا ہوگا۔

میز پر مسودہ پڑا ہوا تھا۔ ڈرامیٹسٹ نے اُٹھا لیا۔ گورو پرشاد نے نیم باز نگاہوں سے ونود کی جانب دیکھا۔ ونود نے امر کی جانب۔ امر نے رسک کی جانب۔ لیکن لفظ کسی کے منہ سے نہ نکلا۔ جیسے سیٹھ جی نے سب کے منہ سی دئے تھے۔ ڈرامیٹسٹ صاحب کتاب لیکر چل دئے۔

سیٹھ جی۔ نے مسکرا کر کہا۔ حضور کو تھوڑی سی تکلیف اور کرنی ہوگی ڈرامہ کا ریہرسل شروع ہونے پر آپ کو تھوڑے دنوں کمپنی کے ساتھ رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑیگی۔ ہمارے ایکٹر بیشتر گجراتی ہیں۔ یہ ہندی زبان کے تلفظ کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ کہیں کہیں الفاظ پر بلا ضرورت زور دیدیتے ہیں۔ آپ کی نگرانی سے یہ تمام خامیاں دُور ہو جائینگی۔ اگر ایکٹروں نے پارٹ اچھا ادا نہ کیا۔ تو آپ کی تمام محنت پر پانی پھر جائیگا۔ یہ کہتے کہتے اِس نے لڑکے کو آواز دی۔ ”بوائے آپ لوگوں کے لئے سگار لاؤ“

سگار آ گیا۔ سیٹھ جی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ دوستوں کی انجمن کو رخصت ہو جانے کا اشارہ تھا۔ پانچوں دوست بھی اُٹھے۔ سیٹھ جی دروازے تک آئے پھر سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

آج اِس غریب کمپنی کا تماشہ دیکھ لیجئے۔ پھر خدا جانے کب اتفاق ہو۔
گورو پرشاد نے جیسے کسی قبر کے نیچے سے کہا۔ ہو سکا تو آ جاؤں گا۔
سڑک پر آکر پانچوں دوست ایک دوسرے کا مُنہ تاکنے لگے۔ تب پانچوں
زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔
ونود نے کہا۔ یہ ہم سب کا ہی گورو گھنٹال نکلا۔
امر۔ آنکھوں میں صاف دُھول جھونک دی۔
رسک۔ میں اِس کی خاموشی دیکھ کر پہلے ہی سے ڈر رہا تھا۔ کہ یہ کوئی اول
درجہ کا گھاگھ ہے۔
مست۔ مان گیا۔ اس کی کھوپڑی کو۔ یہ چپت عمر بھر نہ بھولیگی۔
گورو پرشاد۔ ان چہ میگوئیوں میں شریک نہ ہو سکے۔ وہ اِس طرح سر جھکائے
چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ ان حالات کی تہ تک ہی نہیں پہنچ سکے۔

---

(۱)

آج بابو دیو کی ناتھ اپنی پندرہ سال کی بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر نئی شادی کرنے جا رہے ہیں۔ عزیز و اقربا جمع ہیں۔ مگر کوئی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ کہ آخر اِس بیکس پہ اتنا عتاب کیوں ہے؟ بابو دیو کی ناتھ سے کیوں بُرے بنیں۔ دروازہ پر نوبت جھڑ رہی ہے۔ اندر مستورات بیاہ کے گیت گا رہی ہیں۔ نوکر چاکر خوش رنگ وردیاں پہنے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ براتی اصحاب اپنی اپنی آرائش میں مصروف ہیں۔ مگر اِس شادی کے ساتھ ایک عزیز جان کا خون ہو رہا ہے اس کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔

آج پندرہ سال ہوئے۔ جب دیو کی ناتھ کی شادی پھولونتی سے ہوئی تھی پھولونتی حسین تھی۔ باتمیز تھی، شیریں دہن تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ دیو کی ناتھ بھی نیک اطوار مستقل مزاج۔ روشن خیال۔ مگر پہلے ہی دن دولہا دُلہن میں کچھ ایسی بدمزگی پیدا ہوئی۔ کہ دونوں میں ایک خلیج حائل ہو گئی۔ اور زمانہ کے ساتھ وہ خلیج وسیع

ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج دیو کی ناتھ نئی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔
اور اس بدمزگی کا باعث کیا تھا؟ معاشرتی معاملات میں اختلاف۔ دیو کی ناتھ پرانی تہذیب کے قائل تھے۔ پھولوتی نئی روشنی کی دلدادہ۔ پرانی تہذیب پردہ چاہتی ہے، تحمل اور صبر چاہتی ہے، نئی روشنی آزادی چاہتی ہے، اعزاز چاہتی ہے۔ حکومت چاہتی ہے۔ دیو کی ناتھ چاہتے تھے۔ پھولوتی میری ماں کی خدمت کرے، بغیر اجازت گھر سے قدم نہ نکالے۔ لمبا سا گھونگٹ نکال کر چلے۔ پھولوتی کو ان باتوں میں سے ایک بھی پسند نہ تھی۔ دونوں میں مباحثے ہوئے۔ سخت کلامیوں کی نوبت آئی۔ شکر رنجی ہوئی۔ میاں نے بیوی کے میکے والوں کی تحقیر کی، بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میاں نے ڈانٹ بتائی۔ بیوی نے میکہ کی راہ لی۔ میکہ بھی دور نہ تھا۔ دس منٹ میں گھر جا پہنچی۔ مہینوں تک دونوں کھینچے رہے۔ پھر پھولوتی منائی گئی۔ سسرال آئی۔ مگر دو ہی چار دن میں وہی قضیئے شروع ہو گئے۔ نہ دیو کی ناتھ اپنے طرز عمل کی اصلاح کر سکتے تھے، نہ پھولوتی اپنے طرز عمل کی۔ اب کے برسوں بول چال بند رہی۔ آخر احباب کے سمجھانے سے دیو کی ناتھ تیسری بار بیوی کو منا لائے۔ مگر اب کے معاملات نے کچھ ایسا طول کھینچا۔ کہ دائمی مفارقت ہو گئی۔ نہ انہوں نے بلایا۔ نہ وہ آئی۔ اور آج میاں شوہر نئی شادی رچا کر اپنے دل کی آگ بجھا رہے ہیں۔ کیا پھولوتی کے لئے بھی یہی آزادی ہے؟ کیا اسے یہ آزادی ہوتی۔ تو دیو کی ناتھ کو نئی شادی ٹھاننے کا حوصلہ ہوتا۔

دیو کی ناتھ کی ماں صندوق میں زیوروں کو سجا رہی ہیں۔ نئی بہو کی خوشی میں متوالی ہو رہی ہیں۔ اس پر سن لیا ہے۔ کہ بہو ہوشیار ہے۔ مند متگند اور ہے۔ شرمیلی ہے۔ پھر کیا پوچھنا۔ اس لکشمی کے آتے ہی گھر کی رونق ہی کچھ اور ہو جائیگی

پڑوسنیں اُسے چڑھانے کو کہتی ہیں "نئی بہو جی پڑھی لکھی تو خوب ہونگی۔ ساس جی مُنہ بنا کر کہتی ہیں۔ "مجھے میم صاحب کی ضرورت نہیں۔ درگذری ایسی پڑھی لکھی سے مجھے اب گذارہ ہو چاہیئے۔"

دروازہ سے منشی جی آکر بولے، "بھئی جلدی کرو۔ گاڑی چھوٹ جائیگی پھر کوئی دوسری ساعت نہیں ہے۔"

ساس کہتی ہے، "آپ اپنا کام دیکھئے۔ مجھے کوئی دیر نہیں۔ درزی کو بلوا دیجئے۔ نوشہ کو کپڑے پہنا جاوے۔

درزی نے آکر جوڑا پہنایا، مالی نے آکر سہرا باندھا، چمار نے آکر جوُتی پہنائی۔ پھوپھا جی پگڑی سنوار گئے۔ بوا جی نے آکر آنکھوں میں کاجل لگایا، مامی نے آکر بندن وار باندھ دی۔ دولہا آدمی سے بندر بن گیا۔ ۵۴ سال کی عمر کچھ کچھ بالوں میں سفیدی آچلی تھی۔ دو چار دانت بھی جواب دے چکے تھے۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی۔ مگر وضع ایسی گویا ابھی عنفوان شباب ہے۔

(۲)

ادھر پھولوتی کے باپ کو خبر ملی۔ دریائے تفکر میں ڈوب گئے۔ پہلے سے خبر ہو جاتی۔ تو ہاتھ پاؤں مارتے۔ مگر اب تو برات جانے کو تیار ہے۔ اس تنگ وقت میں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ سوچ رہے تھے۔ ہم لوگوں سے تو نیچی ذاتیں ہی اچھی ہیں۔ ان کو کم سے کم برادری کا خوف تو ہے۔ ہم لوگوں نے تو بے غیرتی پر کمر باندھی ہے۔ ہائے پھولوتی کو معلوم ہوگا۔ تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ آج پندرہ سال شادی ہوئے گذر گئے۔ اسے کیا آرام ملا۔ بیواؤں کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس پر یہ نیا صدمہ! یہ نئی چوٹ اس سے برداشت ہوگی۔

پھولوتی اُن آن پر جان دینے والی عورتوں میں تھی۔ جو دل میں ایک بات ٹھان کر پھر پیچھے ہٹنا نہیں جانتیں۔ اگر وہ ذرا سا بھی دب سکتی۔ تو اس کی زندگی آرام سے کٹ جاتی۔ لیکن پندرہ سال کی بے اعتنائی بھی اس کی خودداری پر فتح نہ پا سکی۔ اسے جوں ہی یہ خبر ملی۔ اس نے دل میں طے کر لیا۔ یہ شادی میرے جیتے جی نہیں ہو گی۔ ہرگز نہیں ہو گی۔ تم نئی بہو کے ساتھ زندگی کے بہار نہیں اُڑا سکتے۔ اگر میں دور رہ کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ تو تم کو بھی یوں ہی جلتے رہنا پڑیگا۔ تم میری چھاتی پر مونگ نہیں دل سکتے۔ اس نے گھر میں کسی سے کچھ نہ کہا والد کو بھی خبر نہ دی۔ آہستہ سے گھر سے نکلی، ایک تانگا کرایہ پر لیا۔ اور سسرال چلی۔ راستہ میں سوچتی جاتی تھی۔ "آج اس زندگی کا آخری فیصلہ کر دونگی۔ دکھلا دونگی۔ کہ آج بھی ہندوستان میں ایسی عورتیں ہیں۔ جو اپنی بات کے لئے ہنستے ہنستے جان دیدیتی ہیں۔ وہ عیش و آرام کے لئے زندہ نہیں رہتیں، بلکہ اپنے دھرم کو پالنے کے لئے"، اسکی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ کبھی آپ ہی آپ ہنستی۔ کبھی آپ ہی آپ روتی۔ نہ جانے کیا بکتی جاتی تھی

اسی بیہوشی کے عالم میں شوہر کے مکان سے بہت دُور نکل گئی۔ جب ہوش آیا۔ تو تانگے والے سے پوچھا۔ یہ کونسا محلّہ ہے۔ بولا یہ تو کٹڑہ ہے۔

"واہ! تم یہاں کہاں لائے۔ مجھے تو سبزی منڈی جانا ہے"۔

"تو آپ نے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ اسی طرف سے تو آیا ہوں۔ کیا آپ کو گھر معلوم نہیں۔"؟

"مجھے خیال نہ تھا"

"دکیا سو گئی تھیں مجھے اتنا چکر پڑا۔

"بک بک مت کرو۔ تانگہ لوٹا لو"

آدھے گھنٹہ میں تانگا دیوکی نانتھ کے دروازے پر جا پہنچا۔

(۳)

برات تیار تھی۔ دُولہا پھولوں سے سجے ہوئے موٹر پہ بیٹھ چکا تھا۔ باجے بج رہے تھے۔ یہ تماشا دیکھ کر پھولوتی کے سینہ پر سانپ، سا لوٹنے لگا۔ جی میں آیا۔ کنوئیں میں کود پڑوں تا کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ جب اپنا کوئی پرسان ہی نہیں۔ تو اس زندگی سے موت کہیں اچھی۔ پہلے یہ خیال ہؤا۔ کیوں نہ میں بھی ان کی چھاتی پر مونگ دلوں۔ انہیں دکھا کر کسی سے شادی کر لوں۔ پھر دیکھوں۔ یہ حضرت کیا کر لیتے ہیں۔ مگر اس خیال کو اس نے دل سے نکال دیا۔ نہیں میں عورتوں کے نام کو داغ نہ لگاؤنگی اپنے خاندان کو بدنام نہ کرونگی۔ مگر ان حضرات کو برات لیکر جانے نہ دونگی چاہے میری جان ہی کیوں جائے

موٹر نے ہارن بجایا اور چلا ہی چاہتی تھی۔ کہ پھولوتی تانگے سے اتر پڑی اور آ کر موٹر کے سامنے کھڑی ہو گئی

دیوکی نانتھ اسے دیکھتے ہی جل بھن کر خاک ہو گئے۔ بولے" تم یہاں کیوں آئیں۔ تمہیں یہاں کس نے بلایا؟

پھولوتی نے مُنہ پھیر کر کہا "مجھے نیوتے کی ضرورت نہ تھی"

دیوکی نانتھ " ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا"

پھولوتی۔ تم شادی کرنے نہیں جا سکتے۔

دیوکی نانتھ " تم مجھے روک لوگی۔

پھولوتی۔ یا تو روک لونگی یا اپنی جان دیدونگی

دیوکی نانتھ۔ اگر جان دینا چاہتی ہو۔ تو کنوئیں میں کود پڑو، یا زہر کھالو۔

اس پر بھی صبر نہ آئے۔ تو دوسری شادی کر لو، یا کسی کو لے کر نکل جاؤ۔ میں تمہیں
نہیں روکتا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں زبان تک نہ ہلاؤنگا۔ میرے پیچھے کیوں پڑتی
ہو۔ میں نے تمہارے لئے اپنی آدھی زندگی تلخ کر دی۔ اب مجھ میں ضبط کی طاقت
نہیں ہے۔ میرا کہنا مانو۔ راستہ سے ہٹ جاؤ ورنہ میں توڑ جلا دونگا۔

پھول وتی۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ مجھے پیروں تلے روند کر ہی تم جا سکتے ہو

دیوکی۔ تم کیا چاہتی ہو۔ میں ساری زندگی تمہارے نام کو روتا رہوں۔ جو
عورت اپنے شوہر سے دشمنی کرے۔ اس کی صورت دیکھنا گناہ ہے"

پھول وتی:۔ میں تمہیں اپنی صورت دکھانے نہیں آئی ہوں۔

دیوکی۔" تو پھر یہ تریا چرتر کیوں کرتی ہو۔ کیوں نہیں کسی طرف اپنا منہ کالا
کرتیں۔ میں ایسی عورتوں کے چرتر خوب جانتا ہوں"

پھول وتی۔ نے خون آب آنکھوں سے دیکھ کر کہا" ذرا زبان سنبھال کر
باتیں کرو۔ ورنہ میری آہ پڑ جائیگی۔ میں اور سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ تحقیر
نہیں برداشت کر سکتی

دیوکی ناتھ نے گردن ہلا کر کہا" ایسی ہی تو بڑی عصمت مآب ہو۔

پھول وتی۔ جو خود بیوفا ہیں۔ انہیں دوسروں سے وفا کی امید رکھنے کا
کوئی حق نہیں

دیوکی ناتھ: تم سے تو پر اترائے۔ بولے" سامنے سے ہٹے گی یا نہیں"

پھولوتی نے مستقل انداز سے کہا "نہیں"۔

دیوکی ناتھ دانت پیس کر بولے" ہٹ جا نہیں میں کچل دونگا۔ ساری
شیخی دھری رہ جائیگی"

پھولوتی۔ تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرو۔ میں نے ایک بار کہہ دیا۔ میں سب

کچھ برداشت کرسکتی ہوں۔ تحقیر نہیں برداشت کرسکتی۔

دیوکی ناتھ۔ میں پھر سمجھائے دیتا ہوں۔ کہ ہٹ جا۔ نہیں کچل دونگا۔ گدھی کہیں کی۔

پھول وتی۔ نکال دے دل کا ارمان تو۔ زبان کیوں خراب کرتے ہو۔ میں دل میں ٹھان کر آئی ہوں۔ کہ میرے جیتے جی تم نہ چین کرنے پاؤ گے۔

دیوکی ناتھ۔ میں نے تو کہہ دیا۔ تو جا کر کسی سے اپنی شادی کرلے۔ مجھ سے دست برداری لکھالے۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ تو میرے نام کو روئے۔

پھول وتی۔ میری شادی تو اب بھگوان کے گھر ہوگی۔ لیکن جیتے جی یہ ستم نہیں برداشت کرسکتی۔

دیوکی ناتھ۔ اب ضبط نہ کرسکے۔ ڈرائیور سے بولے "چلا دو موٹر۔ جو کچھ ہوگا دیکھی جائیگی۔ مجھ پر دھونس جمانے چلی ہے"

ڈرائیور نے موٹر چلانے سے انکار کیا۔ وہ ایک عورت پر دیدہ ودانستہ موٹر چلا کر اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ زندہ رہیگا۔ تو بھیک مانگ کھائے گا۔ ایسی نوکری اسے منظور نہیں۔ وہ موٹر سے اُتر کر چل دیا۔

پھول وتی نے تازیانہ جمایا۔ "تم مجھے موت سے کیا دھمکاتے ہو۔ موت سے ڈرے۔ جسے عیش وآرام کی آرزو ہو۔ یہاں تو مرنے کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں۔ زندہ رہ کر مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ رونے سے جی بھر گیا۔ اب اس کی خواہش نہیں ہے"

دیوکی ناتھ کا غصہ طیش کی حد تک جا پہنچا۔ جب انسان کی قوت تمیز سلب ہو جاتی ہے۔ تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اتنے آدمیوں کے روبرو اور ایک عورت کے ہاتھوں وہ خفیف نہ ہونا چاہتا تھا۔ سفاکانہ عزم کے ساتھ ہارن بجایا۔

پھولوتی ۔ ایک بار چونک پڑی۔ اور فطری حفظ بقا کے زیر اثر ایک قدم ہٹ گئی۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر موٹر کے سامنے آئی اور لیٹ گئی۔ اس کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا۔

دوبارہ ہارن بجا۔

پھولوتی نے جنبش نہ کی۔ اسکی آنکھیں بند تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا دل بیٹھا جاتا ہے۔

موٹر نے تیسری بار ہارن بجایا۔ اور ایک شان فرعونیت کے ساتھ چل پڑا۔ ایک چیخ کی آواز سُن پڑی اور موٹر آگے نکل گیا۔

پھولوتی کا تن نازک زمین پر پڑا ہوا، ستار کے چوٹ کھائے ہوئے تار کی طرح کانپ رہا تھا۔ جس نے کبھی شوہر کا ایک کلمہ سخت نہیں برداشت کیا، وہ آج کیا یہ تحقیر برداشت کر سکتی تھی۔؟

(۴)

نظارہ اتنا دردناک تھا، اتنا نفرت انگیز، اتنا وحشیانہ کہ ہزاروں تماشائیوں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اجتماعی ذہنیت ہمیشہ انتہا کی طرف مائل ہوتی ہے، وہ سب کچھ کر گذرتی ہے۔ جو افراد کے لئے ناقابل خیال ہے۔ سیلاب اگر آبادیوں کو غرقاب کرتا ہے۔ تو زمین کو زرخیز بھی کرتا ہے۔ دریائے تہ نشین کے سکون میں یہ قوتِ عمل کہاں۔ اس مجمع میں ستم ناروا کے خلاف احتجاج کا ایک سیلاب سا آگیا۔ خون بیداد انتقام کے لئے مشتعل ہو گیا۔ قانون پر تصرّف اِس ذہنیت کی خصوصیت ہے۔ صدہا آدمی ایک اندھے جنون کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے۔ دیو کی ناتھ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر سے کھینچ

لیا۔ اور خونخوار درندوں کی طرح ان پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔
آن واحد میں نوشہ اپنی ساری تمنائیں لئے ایک تودہ اُستخوان بنا ہُوا،
خونی سہرا سر پر رکھے زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

دونوں لاشیں آمنے سامنے پڑی ہوئی تھیں، دونوں پر حسرت برس
رہی تھی۔ کون قاتل تھا؟ کون مقتول؟

پھر رات گئے دونوں جنازے چلے۔ ڈھول مجیرے کی جگہ آہ و بکا،
کی گرم بازاری تھی۔ یہ نئی برات تھی۔

اگرچہ میرا حافظہ بہت قوی نہیں تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہو گئیں
وہ ساری تاریخیں جنہیں راتوں کو جاگ کر جبر ڈال کر یاد کیا تھا۔ مگر شادی کی تاریخ
اس ہموار میدان میں ایک ستون کی طرح اٹل ہے نہ بھولتا ہوں نہ بھول سکتا ہوں ان
سے قبل و مابعد کے سارے واقعات دل سے محو ہو گئے ان کا نشان تک باقی نہیں
وہ ساری کثرت ایک وحدت میں مضمر ہو گئی ہے اور وہ میری شادی کی تاریخ ہے۔ بہا چاہتا
ہوں اسے بھول جاؤں۔ مگر جس تاریخ کا روزانہ ورد کیا جاتا ہے۔ وہ کیسے بھول
جائے۔ اور ورد کیوں کرتا ہوں ...... یہ اس مبتلائے غم سے پوچھیے۔
جسے نام خدا کے سوا نجات کا زندگی سے نجات کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہا ہو۔
لیکن کیا میں تاہل سے اس لئے بھاگتا ہوں۔ کہ میں زاہد خشک ہوں!
اور صنفِ لطیف کی دل ربائیوں سے بے اثر۔ کیا میں نہیں چاہتا۔ کہ جب
میں سیر کرنے نکلوں۔ تو اہلیہ بھی جلوہ افروز ہوں؟ تکلفات کی دکانوں پر اُن

کے ساتھ جاکر تھوڑی دیر کے لئے معشوقانہ ابنجا کا لطف اُٹھاؤں؟- میں اس شان
اور مسرّت اور غرور کا اندازہ کر سکتا ہوں- جو میرے دوسرے بھائیوں کی طرح میرے
دل میں بھی تموّج پذیر ہوگا- لیکن میری تقدیر میں وہ خوشیاں، وہ رنگ رلیاں
نہیں ہیں-

کیونکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی تو دیکھتا ہوں- ایک رُخ جتنا ہی دلفریب
اور خوشنما ہے- دوسرا اتنا ہی دل شکن اور ہیبت ناک- شام ہوئی- اور آپ
بدنصیب بچے کو گود میں لئے تیل یا ایندھن والے کی دوکان پر کھڑے ہیں؛
اندھیرا ہوا اور آپ آٹے کی پوٹلی بغل میں دبائے گلیوں میں یوں قدم بڑھاتے
ہوئے نکل جاتے ہیں- گویا چوری کی ہے- صبح ہوئی اور بچوں کو گود میں لئے ہومیو پیتھ
ڈاکٹر کی دوکان میں ٹوٹی کرسی پر رونق افروز ہیں- کسی خوانچے والے کی صدائے
خوش آئند سن کر بچے نے نالۂ فلک رسا بلند کیا اور آپ کی رُوح قبض ہوئی- ایسے
باپوں کو بھی دیکھا ہے- جو دفتر سے لوٹتے ہوئے پیسے دو پیسے کی مونگ پھلی
یا ریوڑیاں لے کر بہ سُرعت تمام مُنہ میں رکھتے چلے جاتے ہیں- کہ گھر پہنچتے پہنچتے
بچوں کی یورش سے قبل وہ ذخیرہ ختم ہو جائے- کتنا مایوس کن ہوتا ہے- وہ نظارہ
جب دیکھتا ہوں- کہ میلے میں بچہ کسی کھلونے کی دوکان کے سامنے مچل رہا ہے
اور قبلہ گاہی صاحب واعظانہ سرگرمی سے کھلونوں کی بے حقیقتی کا راگ
الاپ رہے ہیں-

تصویر کا پہلا رُخ تو میرے لئے ایک شیریں خواب ہے- دوسرا رُخ ایک
روح فرسا حقیقت- اِس حقیقت کے سامنے میرا سارا ذوق تاہل فنا ہو جاتا ہے
میری ساری قوّت ایجاد میری ساری فکرِ رسا، اِسی تاہل کے پھندوں سے
بچنے میں صرف ہوتی ہے- دانہ نہ دام ہے- یہ جانتا ہوں- مگر کتنا گراں، کتنا

ٹھلک! دام خوشرنگ ہے۔ بالکل سُنہرے تاروں کا بنا ہُوا۔ اس میں طائروں کو تڑپتے اور پھڑپھڑاتے دیکھتا ہوں اور پھر شاخ پر جا بیٹھتا ہوں۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے اہلیہ نے پیہم تقاضے کرنے شروع کئے ہیں کہ مجھے بلا لو۔ پہلے جب چھٹیوں میں جاتا تھا۔ تو میرا محض "کہاں چلوگی، کہہ دینا اُس کے اطمینانِ قلب کے لئے کافی ہوتا تھا۔ پھر میں نے، فضول ہے" کہہ کر اُسے تسکین دینا شروع کیا۔ اُس کے بعد خانہ داری کی پریشانیوں سے تخویف کی۔ مگر اب کچھ دنوں سے اُس کی بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔ اب میں نے چھٹیوں میں بھی اس کے تقاضے کے خوف سے گھر جانا بند کر دیا ہے۔ کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ چل کھڑی ہو۔ اور انواع و اقسام کے حیلوں سے اُسے ڈراتا رہتا ہوں۔

میرا پہلا حیلہ اخبار نویس کی زندگی کی مُشکلات سے متعلق تھا۔ بے انتہا تکلیف دہ۔ کبھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے؛ کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے، صبح ہوتے ہی وہ دادوش، وہی ہنگامہ آرائی۔ اُس پر طرّہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ شمشیر لٹکتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں۔ کب ضمانت طلب ہو جائے خفیہ پولیس کی ایک فوج ہمیشہ پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کبھی بازار میں نکل جاتا ہوں۔ تو لوگ انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر کہتے ہیں۔ وہ جا رہا ہے اخبار والا۔ گویا دُنیا میں جتنی آفات ارضی و سماوی۔ نسلی و مذہبی۔ ملکی و قومی ہیں اُن کا ذمّہ دار میں ہوں۔ گویا میرا دماغ جھوٹی خبریں گھڑنے کا کارخانہ ہے۔ سارا دن افسروں کی سلامی اور پولیس کی خوشامد میں گزر جاتا ہے۔ کنسٹبلوں کو دیکھا اور رُوح فنا ہوئی۔ کہ خدا جانے کیا آفت برپا کریں۔ میری تو یہ حالت اور حکّام ہیں۔ کہ میری صورت سے ہراساں۔ ایک دن شامت اعمال سے

کسی انگریز کے بنگلے کی طرف جا نکلا۔ صاحب نے پوچھا۔ کیا کام کرتا ہے
میں نے ایک شان کے ساتھ کہا۔ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ صاحب فوراً اندر گھس
گئے۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر میں نے میم صاحبہ اور بابا لوگوں کو کھڑکیوں
سے جھانکتے دیکھا۔ گویا کوئی خطرناک جانور ہے۔ ایک بار ریل گاڑی میں
سفر کا اتفاق ہؤا۔ ساتھ اور بھی کئی دوست تھے۔ اِس لئے اپنے پیشہ کا
وقار قایم رکھنے کے لئے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑا۔ گاڑی میں بیٹھا۔ تو ایک
صاحب نے میرے سوٹ کیس پر میرا نام اور پیشہ دیکھتے ہی فوراً اپنا صندوق
کھولا اور ریوالور نکال کر میرے روبرو اِس میں گولیاں بھریں۔ تا کہ مجھے معلوم
ہو جائے کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں۔

میں نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر مطلق نہیں کیا۔ کیونکہ میں جنسِ لطیف
سے ایسا تذکرہ کرنا اپنی شانِ مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔

مجھے یقین تھا۔ کہ اہلیہ اِس خط کے بعد پھر یہاں آنے کے لئے اصرار نہ
کرے گی۔ مگر یہ خیال غلط نکلا۔ اور اُن کے تقاضے بدستور قایم رہے۔

تب میں نے دوسرا حیلہ سوچا۔ شہروں میں بیماریوں کی گرم بازاری ہے
ہر ایک کھانے پینے کی چیز میں سمیت کا اندیشہ۔ دودھ میں سمیت۔ گھی میں
سمیت؛ پھلوں میں سمیت۔ سبزی میں سمیت، ہوا میں سمیت۔ پانی میں سمیت
یہاں انسان کی زندگی نقش بر آب ہے جسے آج دیکھو وہ کل غائب۔ اچھے
خاصے بیٹھے ہیں۔ دل کی حرکت بند۔ گھر سے سیر کرنے نکلے۔ موٹر سے ٹکرا کر
راہیٔ عدم۔ اگر کوئی شام کو زندہ و سلامت گھر آ جائے۔ تو اُسے خوش نصیب
سمجھو۔ مچھر کی آواز کان میں آئی۔ اور دل بیٹھا۔ مکھی نظر آئی۔ اور ہاتھ پاؤں
پھولے۔ چوہا بل میں سے نکلا اور جان نکل گئی۔ جدھر دیکھئے ملک الموت۔

اگر موٹر اور ٹرام سے بچ کر آ گئے تو مچھر اور مکھی کے شکار ہوں۔ کہاں بچ کر جاؤ گے
بس یہی سمجھ لو۔ کہ موت ہر دم سر پر کھیلتی رہتی ہے۔ ساری رات مچھروں سے
جنگ کرتے گزرتی ہے۔ دن بھر مکھیوں سے لڑتا ہوں۔ ننھی سی جان کو
کن کن دشمنوں سے بچاؤں۔ سانس بھی مشکل سے لیتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی
تپ دق کا کیڑا پھیپھڑے میں نہ داخل ہو جائے۔ وغیرہ

بیوی کو پھر بھی مجھ پر یقین نہ آیا۔ دوسرے خط میں بھی وہی اصرار موجود
تھا۔ لکھا تھا۔ تمہارے خط نے ایک اور فکر پیدا کر دی۔ اب ہر روز خط لکھا کرنا
ورنہ میں ایک نہ سنوں گی۔ اور سیدھے چلے آؤں گی۔ میں نے دل میں کہا۔ چلو
سستے چھوٹے۔

مگر یہ فکر لگا ہوا تھا۔ کہ نہ جانے کب انہیں شہر آنے کی سنک سوار ہو جائے
اس لئے میں نے ایک تیسرا حیلہ سوچ نکالا۔ یہاں دوستوں کے مارے جان
عذاب میں رہتی ہے۔ احباب آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ گویا
اپنا گھر بیع کر آئے ہیں۔ اگر گھر سے ٹل جاؤ تو آ کر بے محابا کمرہ میں بیٹھ جاتے
ہیں۔ اور نوکر سے سگرٹ، پان، ناشتہ، ادھار منگوا کر کھاتے ہیں۔ دینا مجھے پڑتا
ہے۔ بعض تو ہفتوں پڑے رہتے ہیں۔ ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ روزانہ ان
کی خاطر مدارات کرو۔ شام کو تھیٹر یا فلم دکھاؤ، رات کو ایک دو بجے تک تاش
یا شطرنج کھیلو، اکثر احباب شراب کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اکثر تو بیمار
ہو کر آتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر بیمار ہی آتے ہیں۔ اب روزانہ ڈاکٹر کو بلاؤ تیمارداری
کرو، رات رات بھر سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے رہو۔ اکثر آ کر دیکھتا ہوں۔ تو خدمتگار
غائب ہے۔ گھنٹوں اس کی تلاش میں گھومتا ہوں۔ تب پتہ چلتا ہے۔ کہ ایک
دوست نے اسے ذرا ایک کام سے بازار بھیج دیا تھا۔ میری گھڑی مہینوں سے

میری کلائی پر نہیں آئی، دوستوں کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہی ہے
اچکن ہے۔ وہ ایک صاحب کے پاس، کوٹ دوسرے صاحب لے گئے
جوتے ایک اور بابو لے اڑے۔ میں وہی پرانا کوٹ اور وہی خارج شدہ جوتا
پہن کر دفتر جاتا ہوں۔ احباب تاڑتے رہتے ہیں۔ کہ کونسی چیز نئی لایا۔ کوئی
چیز لاتا ہوں۔ تو وہ صندوق میں بند پڑی رہتی ہے۔ استعمال کروں۔ تو
کسی نہ کسی صاحب کی فرمائش ہو جائے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے۔ تو
چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر آتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی صاحب اس لئے میرے
منتظر نہ بیٹھے ہوں۔ کہ آج ضرورت ہے۔ کچھ روپے دے دو۔ معلوم نہیں ان
کی ساری ضرورتیں پہلی ہی تاریخ کی کیوں منتظر رہتی ہیں۔ ایک دن تنخواہ لے کر
بارہ بجے رات کو لوٹا۔ مگر دیکھا تو اس وقت بھی دو اصحاب رونق افروز تھے
تقدیر ٹھونک لی۔ کتنے ہی بہانے کروں۔ ان کے سامنے ایک بھی پیش نہیں
جاتی۔ میں کہتا ہوں۔ گھر سے خط آیا ہے؛ والدہ صاحبہ بہت بیمار ہیں۔ وہ
جواب دیتے ہیں۔ اجی بوڑھے اتنی جلد نہیں مرتے۔ مرنا ہی ہوتا۔ تو اتنے
دنوں زندہ ہی کیوں رہتیں۔ دیکھ لینا دو چار روز میں اچھی ہو جائینگی۔ کہتا ہوں
ارے یار، گھر سے بہت ضروری خط آیا ہے۔ مال گذاری کا سخت تقاضا ہو
رہا ہے۔ جواب ملتا ہے۔ آجکل تو لگان بندی ہو رہی ہے۔ اور تمہیں بھی اس
کی تقلید کرنی چاہئے۔ اگر کسی تقریب کا حیلہ کرتا ہوں۔ تو فرماتے ہیں۔ تم بھی
کیا عجیب الخلقت انسان ہو۔ ان بیہودہ مراسم کی پابندی کرنا تمہاری شان
کے خلاف ہے۔ اگر تم ان مراسم کی بیخ کنی نہ کروگے۔ تو وہ لوگ کیا آسمان
سے آئینگے۔ خاموش ہو جاتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ کسی طرح گلا نہ چھوڑینگے۔
پھر کیوں مفت میں سر مغزن کروں۔

مجھے یقین تھا۔ کہ اِس خط کے بعد بیوی پھر یہاں آنے کا نام نہ لیگی۔ مگر اب کی پھر وہ خیال غلط نکلا۔ جواب میں پھر وہی تقاضا تھا۔ خیریت اتنی ہوئی کہ اُنہوں نے خط لکھنے پر ہی اکتفا کی۔

تب میں نے چوتھا حیلہ سوچا۔ یہاں کے مکان ہیں۔ کہ خدا کی پناہ! نہ ہوا، نہ روشنی، نہ وسعت! اعراض ثلاثہ کا کہیں پتہ نہیں۔ وہ غضب کا تعفن کہ دماغ پھٹا جاتا ہے۔ کتنوں ہی کو تو اِسی تعفن کے باعث مالیخولیا، اختلاجِ قلب، ضیق النفس یا ٹائیفائیڈ ہو جاتا ہے۔ بارش ہوئی اور مکان ٹپکنا شروع ہؤا۔ پانی ادھر گھنٹہ بھر سے مکان رات بھر برستا رہتا ہے! رات بھر مکانوں کے گرنے کی صدا آتی رہتی ہے۔ صبح کو اُٹھو تو کوئی یہاں ملبہ میں مدفون ہے، کوئی وہاں۔ رات کو وحشت ہوتی ہے۔ ایسے بہت کم مکان ہونگے۔ جن میں پلید ارواح کا گذر نہ ہو۔ ہولناک خواب دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ رات کو رو پڑتے ہیں۔ چیخ اُٹھتے ہیں! کتنے ہی جنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج گھر میں آئے کل مکان تبدیل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی۔ کوئی ٹھیلہ اسباب سے لدا ہؤا جا رہا ہے، کوئی آ رہا ہے۔ بس جدھر دیکھئے ٹھیلے ہی ٹھیلے نظر آتے ہیں۔ چوریاں تو اس کثرت سے ہوتی ہیں۔ کہ اگر کوئی رات خیریت سے گذر جائے۔ تو دیوتاؤں کی منت کی جاتی ہے۔ آدھی رات ہوئی۔ اور چور! چور! لینا لینا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لوگ دروازوں پر موٹے موٹے لکڑی کے پھٹے یا جوتے یا دست پناہ یا چیل قدمی کی چھڑی لئے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر بھی چور اتنے شاطر ہیں۔ کہ نظر بچا کر اندر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایک میرے بے تکلف دوست ہیں۔ رات اندھیرے میں برتن کھڑکے تو میں نے بجلی کی بتی جلائی۔ دیکھا تو دہی حضرت برتن سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے جاگتے دیکھ کر زور سے قہقہہ مارا اور بولے میں تجھے

چکمہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں سمجھ لیا۔ کہ اگر نگل جاتے۔ تو برتن آپ کے تھے
جاگ ہو گئی۔ تو چکمہ ہو گیا۔ گھر میں آئے کیسے تھے۔ یہ معمّا ہے۔ غالباً رات کو تاش
کھیل کر چلے۔ تو باہر جانے کے بدلے نیچے اندھیری کوٹھڑی میں چھپ گئے۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے خط لکھوانے آئے۔ شامتِ اعمال
کمرہ میں قلم دوات نہ تھی۔ اوپر کے کمرہ سے لانے گیا۔ لوٹ کر آیا۔ تو دیکھا حضرت
غائب ہیں۔ اور اُن کے ساتھ گھڑی بھی غائب ہے۔

مگر بیوی پر شہری زندگی کا ایسا جادو چڑھا ہُوا ہے۔ کہ میرا کوئی حیلہ کُسے
خائف نہیں کرتا۔ اِس خط کے جواب میں اس نے لکھا۔ تم مجھ سے بہانے کرتے
ہو اور خود وہاں سیر سپاٹے کا لُطف اُٹھاتے ہو۔ میں ہرگز نہ مانوں گی۔ آکر مجھے
لے جاؤ۔

آخر مجھے پانچواں حیلہ کرنا پڑا۔ یہ خوانچے والوں کے متعلق تھا۔ ابھی بستر سے
اُٹھنے کی نوبت نہیں آئی۔ کہ کانوں میں عجیب غریب صدائیں آنے لگیں۔ شائد
بابل کے مینار کی تعمیر کے وقت بھی ایسی ہی گوناگوں مہمل صدائیں آتی ہونگی۔ یہ
خوانچے والوں کی صدائے بے ہنگام ہے۔ مُناسب تو یہ تھا۔ کہ یہ سب نغمہ و چنگ
کے ساتھ اپنی چیزوں کی جانب لوگوں کو مائل کرتے۔ یہاں کے موسیقی کالج
میں چار پانچ سال اس فن کو حاصل کرتے۔ مگر اِن اندھی عقل والوں کو یہ کہاں
سوجھتی ہے! اس طرح شیطانی صدائیں نکالتے ہیں۔ کہ سُننے والوں کے
رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اور بچّے ماں کی گود سے چرٹ جائیں۔ میں بھی تو
راتوں کو اکثر چونک پڑتا ہوں۔ ایک روز تو میرے پڑوس میں ایک سانحہ ہو گیا
گیارہ بجے تھے۔ کوئی خاتون شاید بچے کو دودھ پلانے اٹھی تھیں۔ یکایک جو کسی
خوانچے والے کی صدائے مہیب کانوں میں آئی۔ تو چیخ مار کر چلا اٹھیں اور پھر

بے ہوش ہوگئیں۔ مہینوں کی دوا دارو کے بعد صحت ہوئی۔ اب رات کو کانوں میں روئی ڈال کر سوتی ہیں۔ ہر چند کہا گیا۔ کہ خوانچے والے کی صدائیں پر انہیں یقین نہیں آتا۔ اور ایسے سانحے شہروں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ کئی احباب اپنی بیویوں کو لائے۔ مگر بیچاریاں دُوسرے ہی دن اِن صداؤں سے خائف ہو کر واپس چلی گئیں۔

مگر اہلیہ نے اسے بھی میرا حیلہ ہی سمجھا۔ تم سمجھتے ہو۔ میں خوانچے والوں کی آوازوں سے ڈر جاؤں گی۔ یہاں گیدڑوں کا ہُوّا ہُوّا ، اور اُلوؤں کا شور سُن کر تو ڈرتی نہیں۔ خوانچے والوں کی آوازوں سے ڈر جاؤں گی۔ مجھے ایسی باتوں سے نہ ڈرائیے۔!

آخر میں نے اب کی کوئی ایسا حیلہ سوچ نکالنے کی ٹھانی۔ جو اس خوف کا یک لخت خاتمہ کر دے۔ اہلیہ صاحبہ کو شہری زندگی سے مدت العمر کے لئے نفرت ہو جائے۔ کئی دنوں کے بعد مجھے ایک حیلہ سوجھا۔ اگرچہ اس میں کچھ اپنی رسوائی کا بھی اندیشہ تھا۔ لیکن رسوائی ہو جائے۔ کوئی غم نہیں۔ وہ مصیبت تو سر پہ نہ پڑے۔

میں نے لکھا۔ کہ یہ شریف زادیوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں کی مہریاں اتنی بد زبان ہیں۔ کہ باتوں کا جواب گالیوں سے دیتی ہیں۔ اور اُن کی وضع و قطع کا کیا پُوچھنا۔ شریف زادیاں تو اُن کا ٹھاٹھ دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوئی۔ سامنے سے نکل جاتی ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ خوشبو کی لپٹ نکل گئی۔ کوئی شریف عورت یہ ٹھاٹھ کہاں سے لائے۔ اُسے تو اور بھی سینکڑوں فکریں ہیں۔ اِنہیں تو بناؤ سنوار کے سوا دوسرا کام ہی نہیں۔ روز نئی سج دھج، نت نئی ادا

اور شوخ تو اِس غضب کی ہیں۔ کہ گویا جسم میں سیماب بھر دیا گیا ہو۔ اُن کا چمکنا اور مٹکنا، لجانا اور مُسکرانا دیکھ کر بچاری بھلے گھروں کی عورتیں شرما جاتی ہیں۔ اور ایسی گُستاخ ہیں۔ کہ خواہ مخواہ گھروں میں گھس پڑتی ہیں، کہیں کسی دوست کے گھر سے کوئی چیز لیکر کہیں کسی دوسرے بہانہ سے کوئی اُکتنا ہی چاہے۔ کہ اُن سے آنکھیں چار نہ ہوں مگر غیر ممکن۔ جد بر دیکھو ان کا میلہ سا لگا ہُوا ہے ابھی اکثر تو خط لکھانے کے بہانے سے کبھی خط پڑھانے کے بہانے سے گھروں میں آجاتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ گھر والیوں کو جلاتی ہیں۔

معلوم نہیں۔ اِس خط میں مجھ سے کون سی غلطی ہو گئی۔ کہ تیسرے ہی دن اہلیہ مُحترمہ ایک بوڑھے کہار کے ساتھ، میرا پتہ پُوچھتی ہوئی، اپنے تینوں بچوں کو لئے ایک بلائے بے درمان کی طرح وارد ہو گئیں۔

میں نے بدحواس ہو کر پوچھا۔ کیوں خیریت تو ہے؟

اہلیہ نے چادر اُتارتے ہوئے کہا۔ گھر میں کوئی چڑیل بیٹھی تو نہیں ہے؟ یہاں کسی نے قدم رکھا تو ناک ہی کاٹ لونگی۔ ہاں جو تمہاری منشا نہ ہو۔

اچھا تو اب عُقدہ کھُلا۔ میں نے سر پیٹ لیا۔ کیا جانتا تھا۔ اپنا طمانچہ اپنے ہی مُنہ پر پڑیگا۔
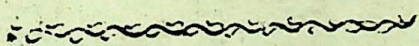
آخری تحفہ

سارے شہر میں صرف ایک ایسی دوکان تھی۔ جہاں ولائیتی ریشمی ساڑھی مل سکتی تھی۔ اور سبھی دوکانداروں نے ولائیتی کپڑے پر کانگرس کی مہر لگوالی تھی۔ مگر امرناتھ کی محبوبہ کی فرمائش تھی۔ اِس کی تعمیل ضروری تھی۔ کئی دن تک شہر کی دوکانوں کا چکر لگاتے رہے۔ دونے دام دینے پر تیار تھے۔ لیکن کہیں مقصد نہ پورا ہوا۔ اور اُس کے تقاضے شدید سے شدید تر ہوتے جاتے تھے۔ ہولی آرہی تھی آخر وہ ہولی کے دن کونسی ساڑھی زیب تن کریگی۔ اِس کے روبرو اپنی معذوری کا اظہار امرناتھ کی مردانہ خودداری کے لئے محال تھا۔ اِس کے اشارہ سے وہ آسمان کے تارے توڑ لانے کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے۔ آخر جب کہیں مقصد برآری نہ ہوئی۔ تو انہوں نے اُسی خاص دوکان پر جانے کا ارادہ کیا۔ یہ معلوم تھا۔ کہ اِس دوکان پر دھرنا دیا جا رہا ہے۔ صبح سے شام تک رضاکار تعینات رہتے ہیں۔ اور تماشائیوں کا بھی ہر دم خاصا مجمع رہتا ہے۔ اِس لئے اِس دکان میں جانے کے لئے ایک خاص صنف کی اخلاقی ہمت درکار تھی۔ اور یہ ہمت امرناتھ میں ضرورت سے کم تھی۔ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ قومی جذبات سے بھی عاری نہ تھے

حتی الامکان سُدیشی چیزیں ہی استعمال کرتے تھے۔ مگر اِس معاملہ میں بہت راسخ
نہ تھے۔ سودیشی مل جائے تو بہتر ورنہ بدیشی ہی سہی۔ اِس اصُول کے پیرو تھے
اور خاص کر جب اُن کی فرمائش تھی۔ تب تو کوئی مفر ہی نہ تھا۔ اپنی ضروریات
کو تو وہ شاید کچھ دنوں کے لئے ملتوی بھی کر دیتے۔ مگر اُن کی فرمائش تو مرگ
بے ہنگام ہے۔ اِس سے نجات کہاں ممکن۔ طے کر لیا کہ آج ساڑھی ضرور لائینگے
کوئی کیوں روکے؟ کسی کو روکنے کا کیا مجاز ہے؟ مانا سُدیشی کا استعمال احسن
ہے۔ لیکن کسی کو جبر کرنے کا کیا حق ہے؟ اچھی جنگ آزادی ہے۔ جس میں
شخصی آزادی کا اتنی بے دردی سے خون ہو۔ یوں دل کو مضبوط کر کے وہ شام
کو دوکان پر پہنچے۔ دیکھا تو پانچ رضاکار پکٹ کر رہے ہیں۔ اور دوکان کے سامنے
سڑک پر کئی ہزار تماشائی کھڑے ہیں۔ سوچنے لگے دوکان میں کیسے جائیں۔ کئی
بار کلیجہ مضبوط کیا اور چلے۔ مگر برآمدہ تک جلتے جلتے ہمت نے جواب دیدیا۔

اتفاق سے ایک جان پہچان کے پنڈت جی مل گئے۔ اُن سے پوچھا۔
کیوں جناب یہ دھرنا کب تک رہیگا؟ شام تو ہو گئی؟

پنڈت جی نے فرمایا۔ ان سرپھروں کو صُبح اور شام سے کیا مطلب
جب تک دُکان بند نہ ہو جائیگی۔ یہاں سے نہ ٹلینگے۔ کیا کچھ خریدنے کا
ارادہ ہے؟ آپ تو ریشمی کپڑا نہیں خریدتے۔

امرناتھ نے معذوری کے انداز سے کہا۔ میں تو نہیں خریدتا مگر مستورات
کی فرمائش کو کیسے ٹالوں؟

پنڈت جی نے مسکرا کر کہا۔ واہ! اِس سے زیادہ آسان تو کوئی بات نہیں
عورتوں کو بھی چکمہ نہیں دیسکتے۔ سو حیلے اور ہزار بہانے ہیں۔

امرناتھ۔ آپ ہی کوئی حیلہ سوچئے۔

پنڈت جی۔ سوچنا کیا ہے۔ یہاں رات دن یہی کیا ہی کرتے ہیں۔ سو پچاس
حیلے ہمیشہ جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ عورت نے کہا ہار بنوا دو۔ کہا۔ آج ہی
لو۔ دو چار روز کے بعد کہا۔ سنار مال لے کر چمپت ہو گیا۔ یہ تو روز کا دھندا ہے۔
بھائی جان مستورات کا کام فرمائش کرنا ہے۔ مردوں کا کام اُسے خوبصورتی سے
ٹالنا ہے۔

امرناتھ۔ آپ تو اِس فن کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

پنڈت جی۔ کیا کریں بھائی صاحب۔ آبرو تو بچانی ہی پڑتی ہے۔ سوکھا
جواب دیں۔ تو شرمندگی الگ ہو، خفگی الگ۔ وہ سمجھیں ہماری پرواہ ہی نہیں کرتے
آبرو کا معاملہ ہے۔ آپ ایک کام کیجئے۔ یہ تو آپ نے کہا ہی ہوگا۔ کہ آجکل پکٹنگ ہے،

امرناتھ۔ ہاں یہ عذر تو کر چکا برادر۔ مگر وہ سنتی ہی نہیں کہتی ہیں۔ کیا ولائتی
کپڑے دنیا سے اُٹھ گئے۔ مجھ سے چلے ہو اُڑنے۔

پنڈت جی۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کوئی دھن کی پوری عورت ہے۔ تو میں ایک
ترکیب بتاؤں۔ ایک خالی کارڈ کا بکس لے لو۔ اِس میں پرانے کپڑے جلا کر
بھر لو۔ جا کر کہہ دینا میں کپڑے لئے آتا تھا۔ والنٹیروں نے چھین کر جلا دیا۔
کیوں کیسی رہیگی؟

امرناتھ۔ کچھ جچتی نہیں۔ کہینگی کیا۔ اجی بیس اعتراضات کریگی۔ کہیں
پردہ فاش ہو جائے۔ تو مفت کی خفت ہو۔

پنڈت جی۔ تو معلوم ہو گیا۔ کہ آپ بودے آدمی ہیں۔ اور ہیں بھی آپ
کچھ ایسے ہی۔ یہاں تو کچھ اِس شان سے حیلے کرتے ہیں۔ کہ حقیقت بھی اُس
کے سامنے گرد ہو جائے۔ زندگی یونہی کرتے گذری اور کبھی گرفتار نہ ہوئے ایک
ترکیب اور ہے۔ اِسی نمونہ کا دیسی مال لے جائیے۔ اور کہہ دیجئے کہ ولائتی ہے۔

امرناتھ۔ دیسی اور ولائتی کی تمیز انہیں مجھ سے اور آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ ولائتی پر تو جلد ولائتی کا یقین نہ آئیگا۔ دیسی کی بات ہی کیا ہے۔

ایک کھدر پوش صاحب قریب ہی کھڑے یہ گفتگو سُن رہے تھے بول اُٹھے۔ ارے صاحب! سیدھی سی تو بات ہے۔ جاکر صاف کہہ دیجئے۔ کہ میں بدیسی کپڑے نہ لاؤنگا۔ اگر ضد کریں۔ تو دن بھر کھانا نہ کھائیے۔ آپ راہ راست پر آجائینگی۔

امرناتھ نے اُن کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جو کہہ رہی تھیں۔ آپ اس کوچہ سے ناآشنا ہیں۔ اور بولے یہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میں نہیں کر سکتا۔

کھدر پوش۔ کر تو آپ بھی سکتے ہیں۔ لیکن کرنا نہیں چاہتے۔ یہاں تو اُن لوگوں میں ہیں۔ کہ اگر بدیسی دُعا سے نجات ملتی ہو۔ تو اُسے بھی ٹھکرا دیں۔

امرناتھ۔ تو شاید آپ گھر میں پکٹنگ کرتے ہونگے۔

کھدر پوش۔ پہلے گھر میں کر کے تب باہر کرتے ہیں۔ بھائی صاحب!

کھدر پوش صاحب چلے گئے۔ تو پنڈت جی بولے۔ یہ صاحب تو تیس مار خاں سے بھی تیز نکلے۔ تو آپ ایک کام کیجئے۔ اِس دُکان کی پُشت پر ایک دُوسرا دروازہ ہے۔ ذرا اندھیرا ہو جائے۔ تو اُدھر سے چلے جائیے گا۔ داہنے بائیں کسی طرف نہ دیکھئے گا۔

امرناتھ نے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا۔ اور جب اندھیرا ہو گیا۔ تو دوکان کے پُشت کی جانب جا پہنچے۔ ڈر رہے تھے۔ کہ کہیں یہاں بھی محاصرہ نہ ہو۔ لیکن میدان خالی تھا۔ لپک کر اندر گئے۔ ایک بیش قیمت ساڑھی خریدی۔ اور باہر نکلے۔ تو ایک دیوی جی زعفرانی ساڑھی پہنے کھڑی تھی۔ اُن کی رُوح فنا ہو گئی۔ دروازہ سے باہر پاؤں رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ایک منٹ تک تو

کواڑ کی آڑ میں چھپے کھڑے رہے۔ پھر دیوی جی کا رُخ دُوسری جانب دیکھکر تیزی سے نکل پڑے۔ اور کوئی سو قدم بھاگتے ہوئے چلے گئے۔ شامتِ اعمال سامنے سے ایک بڑھیا لٹھیا ٹیکتی چلی آ رہی تھی۔ آپ اِس سے لڑ گئے۔ بڑھیا گر پڑی اور لگی بد دعائیں دینے۔ ارے مردوے۔ یہ جوانی بہت دن نہ رہیگی۔ آنکھوں میں چربی چھا گئی۔ دھکے دیتا چلتا ہے۔ امرناتھ اُس کی خوشامدیں کرنے لگے ماتا معاف کرو۔ مجھے رات کو کچھ کم نظر آتا ہے۔ عینک گھر بھُول آیا۔ بڑھیا کا مزاج ٹھنڈا ہُوا۔ آگے بڑھی آپ بھی چلے۔

دفعتہً کانوں میں آواز آئی۔ بابو صاحب ذرا ٹھیریئے گا۔ اور وہی زعفرانی کپڑوں والی دیوی جی آتی ہوئی دکھائی دیں۔ امرناتھ کے پاؤں بندھ گئے۔ اِس طرح کلیجہ مضبُوط کر کے کھڑے ہو گئے۔ جیسے کوئی طالب علم ماسٹر کی بیت کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

دیوی جی نے قریب آکر کہا، آپ تو ایسا بھاگے۔ کہ میں گویا آپ کو کاٹ کھاؤں گی۔ آپ جب پڑھے لکھے آدمی ہو کر اپنا فرض نہیں پہچانتے۔ تو افسوس ہوتا ہے۔ مُلک کی کیا حالت ہے۔ لوگوں کو کھدر نہیں ملتا۔ آپ ریشمی ساڑھیاں خرید رہے ہیں۔

امرناتھ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ دیوی جی۔ میں نے اپنے لئے نہیں خریدا ہے۔ ایک صاحب کی فرمائش تھی۔

دیوی جی نے جھولی سے ایک چوڑی نکال کر اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایسے حیلے روز ہی سُنا کرتی ہوں۔ یا تو آپ اِسے واپس کر دیجئے۔ یا لائیے۔ ہاتھ میں آپ کو چوڑی پہنا دوں۔

امرناتھ۔ شوق سے پہنا دیجئے۔ میں اِسے بڑے فخر سے پہنوں گا۔ چوڑی

اُس قربانی کی ایک علامت ہے۔ جو دیویوں کی زندگی کے لئے مخصوص ہے چوڑیاں اُن دیویوں کے ہاتھ میں بھی تھیں۔ جن کے نام سُنکر آج بھی ہم تعظیم سے سر جھکاتے ہیں۔ میں تو اِسے شرم کی بات نہیں سمجھتا۔ آپ اگر اور کوئی چیز پہنانا چاہیں۔ تو وہ بھی شوق سے پہنا دیجئے۔ عورت پرستش کی چیز ہے حقارت کی چیز نہیں۔ اگر عورت جو قوم کو پیدا کرتی ہے۔ چوڑی پہننا باعثِ فخر سمجھتی ہے۔ تو مردوں کے لئے چوڑی پہننا باعثِ شرم کیوں ہو۔

دیوی جی کو اِس بے غیرتی پر حیرت تو ہوئی۔ مگر وہ اتنی آسانی سے امرناتھ کو چھوڑنے والی نہ تھیں۔ بولیں آپ باتوں کے شیر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ دل سے عورت کو پرستش کی چیز مانتے ہیں۔ تو میری یہ استدعا کیوں نہیں مان جاتے

امرناتھ:- اِس لئے کہ یہ ساڑھی بھی ایک عورت ہی کی فرمائش ہے۔

دیوی۔ اچھا چلیئے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ ذرا دیکھوں۔ آپ کی دیوی جی کس مزاج کی عورت ہیں۔

امرناتھ کا دل بیٹھ گیا۔ غریب ابھی تک بن بیاہا تھا۔ اِس لئے نہیں کہ اُن کی شادی نہ ہوئی تھی۔ بلکہ اِس لئے کہ شادی کو وہ ایک قیدِ زیست سمجھتے تھے۔ مگر آدمی رنگین مزاج تھے۔ تاہل سے محترز ہو کر بھی تاہل کی دلبستگیوں سے بے نیاز نہ تھے۔ کسی ایسے وجود کی ضرورت اُن کے لئے لازمی تھی۔ جس پر وہ محبتوں کو نثار کر سکیں۔ جس کی طراوت سے وہ اپنی خشک زندگی کو تر و تازہ کر سکیں۔ جس کے سایۂ اُلفت میں وہ ذرا دیر کے لئے ٹھنڈک پا سکیں۔ . . . . جس کے دل میں وہ اپنی اُمڈی ہوئی جوانی کے جذبات بکھیر کر اُن کا اُگنا دیکھ سکیں۔ ان کی نظرِ انتخاب مالتی پر پڑی تھی۔ جس کی شہر میں دھوم تھی۔ ادھر ڈیڑھ دو سال سے وہ

اِسی خرمن کے خوشہ چیں بنے ہُوئے تھے۔ دیوی جی کے اِصرار نے انہیں ذرا دیر کے لئے چپقلش میں ڈال دیا۔ ایسی ندامت انہیں زندگی میں کبھی نہ ہُوئی تھی۔ بولے۔ آج تو وہ ایک تقریب میں گئی ہوئی ہیں۔ گھر بند ہوگی

دیوی جی نے بے اعتباری سے ہنس کر کہا۔ تو میں سمجھ گئی۔ یہ آپ کی دیوی جی کا قصور نہیں۔ آپ کا قصور ہے۔

امرناتھ نے خفیف ہو کر کہا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ آج وہ گھر پر نہیں ہیں۔

دیوی نے پوچھا۔ کل آجائینگی۔

امرناتھ بولے۔ ہاں کل آجائینگی۔؟

دیوی۔ تو آپ یہ ساڑھی مجھے دیدیجئے۔ اور کل یہیں آجائیگا۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ میرے ساتھ دو چار بہنیں اور بھی ہونگی۔

امرناتھ نے بے عذر وہ ساڑھی دیوی جی کو دیدی۔ اور بولے۔ بہت خوب! میں کل آجاؤنگا۔ مگر کیا آپ کو مجھ پر اِعتبار نہیں ہے۔ جو ساڑھی کی ضمانت دے کار ہی ہو

دیوی جی نے مُسکرا کر کہا۔ سچی بات تو یہی ہے۔ کہ مجھے آپ کے اوپر اِعتبار نہیں ہے۔

امرناتھ نے خودداری کے ساتھ کہا۔ اچھی بات ہے۔ آپ سے لیجائیں۔

مالتی نے ایک لمحہ کے بعد کہا۔ شائد آپ کو ناگوار گذر رہا ہو۔ کہ کہیں ساڑھی گم نہ ہوجائے۔ اِسے آپ لیتے جائیے۔ مگر کل آئیے گا ضرور۔

امرناتھ کو ایسی غیرت آئی۔ کہ بغیر کچھ کہے۔ گھر کی طرف چل دئیے۔ دیوی جی لیتے جائیے۔ لیتے جائیے کرتی رہ گئیں۔

(۲)

امرناتھ گھر جاکر ایک کھدر کی دکان پر گئے۔ اور دو سوٹوں کا کھدر خریدا اور اپنے درزی کے پاس لے جاکر بولے۔ خلیفہ اِسے راتوں رات تیار کر دو۔ مُنہ مانگی سلائی دونگا۔

درزی نے کہا۔ بابو صاحب آجکل تو ہولی کی بھیڑ ہے۔ ہولی سے پہلے نہ تیار ہو سکیں گے۔

امرناتھ نے اصرار کے ساتھ کہا، میں مُنہ مانگی سلائی دُونگا۔ مگر کل دوپہر تک مل جائیں۔ مجھے کل ایک جگہ جانا ہے۔ اگر دوپہر تک نہ ملے۔ تو پھر میرے کِسی مصرف کے نہ ہونگے۔

درزی نے آدھی سلائی پیشگی لے لی۔ اور کل تیار کر دینے کا وعدہ کیا امرناتھ یہاں سے مطمئن ہو کر مالتی کی طرف چلے۔ قدم آگے بڑھتے تھے لیکن دل پیچھے رہا جاتا تھا۔ کاش وہ اُن کی اِتنی اِلتجا قبول کرلے کہ کل دو گھنٹہ کے لئے اُن کے خانہ ویران کو روشن کر دے۔ لیکن یقیناً وہ انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر مُنہ پھیر لیگی، سیدھے مُنہ بات نہیں کریگی۔ آنے کا ذکر ہی کیا۔ ایک ہی بے مُروّت ہے۔ تو کیا کل آکر دیوی جی سے اپنی ساری شرمناک داستان بیان کر دوں۔ اِس معصوم چہرہ کی بے لوث سرگرمی ان کے دل میں ایک ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کتنی متانت تھی۔ کِتنا سچا جذبہ درد۔ کتنا خلوص! اُس کے سیدھے سادے الفاظ میں کچھ ایسی تحریک عمل تھی، کہ امرناتھ کو اپنی نفس پروانہ زندگی پر شرم آرہی تھی۔ اب تک کانچ کے ایک ٹکڑے کو ہیرا سمجھ کر سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ آج انہیں معلوم ہُوا۔ ہیرا کسے کہتے ہیں؛

اِس کے سامنے وہ ٹکڑا حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ مالتی کی وہ جادو بھری چتون، اُس کی وہ شیریں ادائیں اُس کی وہ شوخیاں اور سحر طرازیاں، سب گویا ملمع اُڑ جانے کے بعد اپنی اصلی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ اور امرناتھ کے دِل میں ایک نفرت پیدا کر رہی تھیں۔ وہ مالتی کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے دیدار کے لئے نہیں، بلکہ اُس کے ہاتھوں سے اپنا دِل چھین لینے کے لئے محبت کا گداگر آج اپنے اندر ایک عجیب استغنا کا احساس کر رہا تھا۔ کہ اُسے حیرت ہو رہی تھی۔ کہ اب تک وہ کیوں اتنا بے خبر تھا۔ وہ طلسم جو مالتی نے برسوں کے عشوہ و فریب سے باندھا تھا۔ آج کسی چھو منتر سے تار تار ہو گیا تھا۔ مالتی نے اُنہیں خالی ہاتھ دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو کر کہا ساڑھی لائے یا نہیں۔

امرناتھ نے بے نیازی کی شان سے کہا، نہ!

مالتی نے استعجاب سے اُن کی طرف دیکھا۔ نہ! اُن کے مُنہ سے وہ نہ سُننے کی عادی نہ تھی۔ یہاں اُس نے کامل تسلیم پائی تھی۔ اِس کا اشارہ امرناتھ کے لئے نوشتۂ تقدیر تھا۔ بولی۔ کیوں؟

امر کیوں کیا۔ نہیں لایا،

مالتی۔ بازار میں ملی نہ ہو گی۔ تمہیں کیوں ملنے لگی۔ اور میرے لئے۔

امر نہیں صاحب ملی۔ مگر لایا نہیں۔

مالتی۔ آخر کوئی وجہ۔ روپے مجھ سے لے جاتے۔

امر۔ تم تو خواہ مخواہ جلاتی ہو۔ تمہارے لئے میں ہمیشہ جان دینے کو حاضر رہا۔

مالتی۔ تو شاید تمہیں روپے جان سے بھی زیادہ پیارے ہونگے۔

امر۔ تم مجھے بیٹھنے دوگی یا نہیں۔ اگر میری صورت سے نفرت ہو تو چلا جاؤں

مالتی۔ تمہیں آج ہو کیا گیا ہے۔ تم تو اتنے تیز مزاج نہ تھے۔

امر- تم باتیں ہی ایسی کر رہی ہو۔

مالتی- تو آخر میری چیز کیوں نہیں لائے۔

امرناتھ- نے اُس کی طرف دلبرانہ انداز سے دیکھ کر کہا- دوکان پر گیا ذِلّت اُٹھائی- مگر ساڑھی لے کر چلا- تو ایک عورت نے چھین لی- میں نے کہا میری بیوی کی فرمائش ہے- تو بولی- میں اُنہیں کو دونگی- کل تمہارے گھر آئینگی۔

مالتی- نے شرارت آمیز انداز سے کہا، تو یہ کہئے آپ اپنا دل ہتھیلی پر لئے پھر رہے تھے- ایک نازنین کو دیکھا اور اُس کے قدموں پر نثار کر دیا۔

امرناتھ- وہ اُن عورتوں میں نہیں ہے- جو دلوں کی گھات میں رہتی ہیں۔

مالتی- تو کوئی دیوی ہو گی،

امرناتھ- میں اُسے دیوی ہی سمجھتا ہوں۔

مالتی- تو آپ اِس دیوی کی پوجا کیجئے گا-؟

امرناتھ- مجھ جیسے آوارہ نوجوان کے لئے اِس مندر کے دروازے بند ہیں

مالتی- بہت حسین ہو گی؟

امرناتھ- نہ حسین ہے- نہ جمیل ہے، نہ خوش ادا ہے، نہ شیریں گفتار ہے نہ نازک بدن ہے، بالکل ایک معمولی معصوم لڑکی ہے- لیکن جب میرے ہاتھ سے اُس نے ساڑھی چھین لی تو میں کیا کر سکتا تھا- میری غیرت نے تو تقاضا نہ کیا- کہ اُس کے ہاتھ سے ساڑھی چھین لوں یہ نہیں انصاف کرو- وہ دل میں کیا کہتی

مالتی- تو تمہیں اُس کی زیادہ پرواہ ہے کہ وہ اپنے دل میں کیا کہیگی- میں کیا کہوں گی- اِس کی مطلق پروانہ تھی- میرے ہاتھ سے کوئی مرد میری کوئی چیز چھین لے- تو دیکھوں، چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہو۔

امرناتھ- اب اِسے چاہے میری بزدلی کہو، چاہے کم ہمتی، چاہے شرافت

میں اس کے ہاتھ سے نہ چھین سکا۔

مالتی:۔ تو کل وہ ساڑھی لے کر آئیگی۔ کیوں؟

امرناتھ۔ ضرور آئے گی۔

مالتی۔ تو جاکر منہ دھو آؤ۔ تم اتنے سادہ لوح ہو۔ مجھے نہ معلوم تھا۔ ساڑھی اُسے دے کر چلے آئے۔ اب کل وہ آپ کو دینے آئیگی۔ معقول کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو

امرناتھ:۔ خیر اُس کا تو کل امتحان ہی ہو جائیگا۔ ابھی سے کیوں بدگمانی کرتی ہو۔ تم شام کو ذرا دیر کے لئے میرے گھر تک چلی چلنا۔

مالتی۔ جس میں آپ کہیں کہ یہ میری بیوی ہے۔

امرناتھ۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ میرے گھر آنے کے لئے تیار ہو جائیگی۔ نہیں کوئی اور بہانہ کر دیتا۔

مالتی:۔ تو آپ کی ساڑھی آپ کو مبارک ہو۔ میں نہیں جاتی۔

امرناتھ۔ میں تو روز تمہارے گھر آتا ہوں۔ تم ایک دن کے لئے بھی نہیں چل سکتیں۔

مالتی نے سنگدلی سے کہا۔ اگر موقعہ آجائے۔ تو تم اپنے کو میرا شوہر پسند کرو گے۔؟ دل پہ ہاتھ رکھ کر کہنا۔

امرناتھ دل میں کٹ گئے۔ بات بناتے ہوئے بولے۔ مالتی۔ تم میرے ساتھ . . . . بے انصافی کر رہی ہو۔ بُرا نہ ماننا ہمارے اور تمہارے درمیان باوجود پیار و محبّت کے اظہار کے ایک مغائرت کا پردہ حائل تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی حالت کو سمجھتے تھے۔ اور اِس پردہ کو ہٹانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ اور یہ پردہ ہمارے تعلقات کی ایک لازمی شرط تھا۔ ہمارے درمیان ایک تاجرانہ سمجھوتہ سا ہو گیا۔ ہم دونوں اُن کی گہرائی میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

نہیں، بلکہ میں ڈرتا تھا، اور تم ارادۃً نہ جانا چاہتی تھیں۔ اگر مجھے یقین ہو جاتا۔ کہ تمہیں رفیقِ حیات بنا کر میں وہ سب کچھ پا جاؤں گا۔ جس کا میں اپنے کو مستحق سمجھتا ہوں۔ تو میں اب تک کبھی تم سے اس کی التجا کر چکا ہوتا۔ لیکن تم نے کبھی میرے دل میں یہ اعتبار پیدا کرنے کی پروا نہ کی۔ میری نسبت بھی تمہیں یہ شک ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن تمہیں یہ شک کرنے کا میں نے کوئی موقعہ نہیں دیا۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اُس سے کہیں بہتر شوہر بن سکتا ہوں۔ جتنی تم بیوی بن سکتی ہو۔ میرے لئے صرف اعتبار کی ضرورت ہے۔ تمہارے لئے زیادہ وزنی زیادہ مادی چیزوں کی۔ میری مستقل آمدنی پانچ سو سے زیادہ ہے.... نہیں۔ تم اس پر قناعت نہ کرو گی۔ میرے لئے صرف اس اطمینان کی ضرورت ہے۔ کہ تم میری اور صرف میری ہو۔ بولو منظور ہے۔

مالتی کو امرناتھ پر رحم آ گیا۔ اُس کی باتوں میں جو صداقت بھری ہوئی تھی۔ اس سے وہ انکار نہ کر سکی۔ اُسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ امرناتھ کی وفا میں لغزش نہ ہو گی۔ اُسے اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا۔ کہ وہ اُسے رسی سے مضبوط جکڑ سکتی ہے لیکن خود جکڑے جانے پر وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکی۔ اُس کی زندگی محبت کی بازیگری میں، اُلفت کی نمائش میں، گذری تھی۔ وہ کبھی اس شاخ پر کبھی اُس شاخ پر چہکتی پھرتی تھی، بے قید آزاد، بے بند۔ کیا وہ طائرِ کنجِ قفس میں خوش رہ سکتا ہے۔؟ جس کی زبان انواع و اقسام کے مزوں کی عادی ہو گئی ہو۔ کیا وہ نانِ خشک پر آسودہ ہو سکتا ہے۔ اس احساس نے اُسے نرم کر دیا۔ بولی۔ آج تم بڑی علمیت بگھار رہے ہو۔

امرناتھ:۔ میں نے تو صرف واقعات بیان کئے ہیں۔

مالتی۔ اچھا میں کل چلوں گی۔ مگر ایک گھنٹہ سے زیادہ وہاں نہ رہونگی۔

امرناتھ کا دِل شکریہ سے لبریز ہو گیا۔ بولا میں تمہارا بیحد مشکور ہوں۔

مالتی، اب میری آبرو بچ جائیگی۔ نہیں تو میرے لئے گھر سے نکلنا مُشکل ہو جاتا۔ اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ تم اپنا پارٹ کتنی خوبصورتی سے ادا کرتی ہو۔

مالتی:۔ اُس کی طرف سے تم اطمینان رکھو۔ بیاہ نہیں کیا۔ مگر براتیں دیکھی ہیں۔ مگر میں ڈرتی ہوں۔ کہیں تم مجھ سے دغا نہ کر رہے ہو۔ مردوں کا کیا اعتبار۔

امرناتھ۔ نے خلوص دل سے کہا۔ نہیں مالتی، تمہارا شبہ بے بنیاد ہے اگر یہ زنجیر پیروں میں ڈالنے کا آرزومند ہوتا۔ تو کبھی کا ڈال چکا ہوتا۔ پھر مجھ جیسے نفس کے بندوں کا وہاں گذر ہی کہاں۔

(۳)

دُوسرے دن امرناتھ دس بجے ہی درزی کی دکان پر جا پہنچے۔ اور سر پر سوار ہو کر کپڑے تیار کرائے۔ پھر گھر آ کر نئے کپڑے پہنے اور مالتی کو بلانے چلے وہاں دیر ہو گئی۔ اُس نے ایسا بناؤ سنگار کیا۔ گویا آج بہت بڑا معرکہ سر کرنا ہے۔

امرناتھ نے کہا۔ وہ حسین نہیں ہے۔ جو تم اتنی تیاریاں کر رہی ہو۔

مالتی نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے چُپ چاپ بیٹھے رہو۔

امر۔ لیکن دیر جو ہو رہی ہے،

مالتی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔

خطرہ کے اِس فطری احتمال نے جو عورتوں کے لئے مخصُوص ہے، مالتی کو زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ اب تک اُس نے کبھی امرناتھ کی جانب خصُوصیت کے ساتھ اِلتفات نہ کیا تھا۔ اُس سے بے پروائی کا سلوک کرتی تھی۔ لیکن کل امرناتھ کے بشرہ سے اُسے ایک خطرہ کی اطلاع مل گئی تھی۔ اور وہ اُس خطرہ کا اپنی

پوری طاقت سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ دشمن کو حقیر اور بے چارہ سمجھنا صنف نازک کے لئے مشکل ہے۔ آج امرناتھ کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ اپنی گرفت کو مضبوط کر رہی تھی۔ اگر اسی طرح اُس کی چیزیں ایک ایک کر کے نکل گئیں۔ تو پھر وہ اپنا وقار کب تک قایم رکھ سکیگی۔ جس چیز پر اُس کا قبضہ ہے۔ اُس کی طرف کوئی آنکھ ہی کیوں اُٹھائے۔ راجہ بھی تو ایک ایک اُنگل زمین کے پیچھے جان دیتا ہے وہ اِس نیئے شکاری کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اُس کے جادو کو توڑ دینا چاہتی تھی۔

شام کو وہ غیرتِ حور بن کر اپنی خادمہ اور ایک نوکر کو لے کر امرناتھ کے گھر چلی۔ امرناتھ نے صبح سے دس بجے تک مردانے گھر کو زنانے پن کا رنگ دینے میں صرف کیا تھا۔ ایسی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ گویا کوئی افسر معائنہ آنے والا ہے مالتی نے گھر میں قدم رکھا۔ تو اُس کی صفائی و سجاوٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ زنانے حصہ میں کئی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بیٹھ کر بولی اب لاؤ اپنی دیوی جی کو۔ مگر جلد آنا۔ ورنہ میں چلی جاؤنگی۔

امرناتھ لپکے ہوئے ولائتی دکان پر گئے۔ آج بھی دھرنا تھا۔ وہی تماشائیوں کا ہجوم۔ وہاں دیوی جی نہ تھیں۔ پشت کی جانب گئے۔ تو دیوی جی ایک لڑکی کے ساتھ اِسی بھیس میں کھڑی تھیں۔

امرناتھ نے کہا۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے دیر ہو گئی۔ میں آپ کے وعدہ کی یاد دلانے آیا ہوں۔

دیوی جی نے کہا۔ میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ چلو سمترا ذرا آپ کے گھر ہو آئیں۔ کتنی دور ہے؟

امرناتھ۔ بہت قریب ہے۔ ایک تانگہ کر لونگا۔

پندرہ منٹ میں امرناتھ دونوں کو لئے ہوئے جا پہونچے۔ مالتی نے دیوی جی کو دیکھا۔ دیوی نے مالتی کو۔ ایک کسی رئیس کا محل تھا، عالی شان، دوسرا کسی فقیر کی کٹی تھی۔ مختصر اور حقیر۔ رئیس کے محل میں تکلّف اور نمائش تھی۔ فقیر کی کٹی میں سادگی اور صفائی۔ مالتی نے دیکھا۔ معدوم دوشیزہ ہے جسے کسی صورت حسین نہیں کہہ سکتے۔ پر اس کی معصومیت اور سادگی میں جو کشش تھی۔ اس سے وہ غیر متاثر نہ رہ سکی۔ دیوی جی نے بھی دیکھا۔ ایک تکلیف پسند، بیباک، مغرور عورت ہے۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے اس گھر میں بیگانہ سی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی جنگلی جانور پنجرے میں آگیا ہو۔

امرناتھ سر جھکائے ہوئے مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔ اور ایشور سے دعا کر رہے تھے۔ کہ کسی طرح آج پردہ رہ جاوے۔

دیوی نے آتے ہی آتے کہا۔ بہن آپ اب بھی سر سے پاؤں تک بدیسی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔

مالتی نے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں بدیسی اور دیسی کے پھیر میں نہیں پڑتی۔ جو یہ لا کر دیتے ہیں۔ وہ پہنتی ہوں۔ لانے والے ہیں یہ۔ میں تھوڑے ہی بازار جاتی ہوں۔

دیوی نے امرناتھ کی طرف گلہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ آپ تو کہتے تھے یہ اُن کی فرمائش ہے۔ یہ تو آپ ہی کا قصور نکل آیا۔

مالتی۔ تو میرے سامنے اُن سے کچھ نہ کہو۔ تم تو بازار میں بھی دوسرے مردوں سے باتیں کر سکتی ہو۔ جب وہ باہر چلے جائیں۔ تو جتنا جی چاہے کوسنا۔ میں اپنے کانوں سے نہیں سُنا چاہتی۔

دیوی۔ میں کچھ کہتی نہیں ہوں۔ بہن جی۔ کہہ ہی کیا سکتی ہوں۔ کوئی زبردستی

تو ہے نہیں۔ صرف عرض کر سکتی ہوں۔
مالتی۔ اِس کے معنے یہ ہیں۔ کہ انہیں اپنے ملک کی بھلائی کا ذرا بھی خیال نہیں
اِس کا ٹھیکہ تمہیں نے لیا ہے۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ دس آدمی عزّت کرتے ہیں
اپنا نفع اور نقصان سمجھ سکتے ہیں۔ تمہیں کوئی مجاز نہیں ہے۔ کہ انہیں اُپدیش
دینے بیٹھو۔ یا سب سے زیادہ عقلمند تمہیں ہو؟

دیوی۔ آپ میرا منشا غلط سمجھ رہی ہیں۔ بہن،
مالتی۔ ہاں غلط تو سمجھوں گی ہی۔ اتنی تمیز کہاں سے لاؤں کہ آپ کی باتوں
کا مطلب سمجھوں۔ کھدر کی ساڑھی پہن لی، جھولی لٹکا لی۔ ایک بلّا لگا لیا۔ بس
آپ کو اختیار ہے۔ جہاں چاہیں آئیں جائیں۔ جس سے چاہیں ہنسیں بولیں۔
گھر میں کوئی پوچھتا نہیں۔ تو جیل خانے جانے کا بھی کیا ڈر۔ میں اِسے ہڑدنگا پن سمجھتی ہوں
جو شریفوں کی بہو بیٹیوں کے لئے جائیز نہیں

امرناتھ۔ دل میں کٹے جا رہے تھے۔ چھپنے کے لئے بِل ڈھونڈ رہے تھے
دیوی کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ تھا۔ لیکن آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔
امرناتھ نے مالتی سے ذرا تیز لہجہ میں کہا۔ کیوں خواہ مخواہ کسی کا دِل دُکھاتی
ہو۔ یہ دیویاں اپنا عیش و آرام چھوڑ کر یہ کام کر رہی ہیں۔ کیا تمہیں اس کی بالکل
خبر نہیں۔

مالتی۔ رہنے دو۔ بہت تعریف نہ کرو۔ زمانہ کا رنگ ہی بدلا جا رہا ہے۔ میں
کیا کروں گی۔ اور تم کیا کرو گے۔ تم مردوں نے عورتوں کو گھر میں اتنی بُری طرح قید کیا
کہ آج وہ رسم و رواج شرم و حیا کو چھوڑ کر نکل آئی ہیں۔ اور کچھ دنوں میں تم لوگوں
کی حکومت کا خاتمہ ہُوا جاتا ہے۔ ولائتی اور دیشی تو دکھانے کے لئے ہے۔
اصل میں یہ آزادی کی خواہش ہے۔ جو تمہیں حاصل ہے۔ تم اگر دو چار شادیاں

کر سکتے ہو تو عورت کیوں نہ کرے۔ تم اگر بازار کی سیر کر سکتے ہو۔ تو عورت کیوں نہ کرے۔ یہ ہے حقیقت اگر آنکھیں ہیں۔ تو اب کھول کر دیکھو۔ مجھے وہ آزادی نہ چاہیئے۔ یہاں تو لاج دھوتے ہیں۔ شرم و حیا کو اپنا سنگار سمجھتی ہیں۔

دیوی جی نے امرناتھ کی طرف فریاد کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ بہن نے عورتوں کو ذلیل کرنے کی قسم سی کھائی ہے۔ میں بڑی بڑی اُمیدیں لے کر آئی تھی۔ مگر شاید یہاں سے ناکام جانا پڑیگا۔

امرناتھ نے وہ ساڑھی اُسے دیتے ہُوئے کہا۔ نہیں بالکل ناکام تو آپ نہ جائینگی۔ ہاں متوقع کامیابی نہ ہوگی۔

مالتی نے تحکمانہ انداز سے کہا وہ میری ساڑھی ہے۔ اِسے تم نہیں دے سکتے

امرناتھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا۔ اچھی بات ہے نہ دونگا۔ دیوی جی ایسی حالت میں تو شاید آپ مجھے معاف کرینگی

دیوی جی چلی گئیں۔ تو امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔ تم نے آج میرے منہ میں کالکھ لگا دی۔ تم اتنی بدتمیز اور بدزبان ہو۔ مجھے نہ معلوم تھا۔

مالتی نے تند لہجہ میں کہا۔ تو اپنی ساڑھی لُٹے دیدیتی۔ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ اب تو بدتمیز بھی ہوں بدزبان بھی ہوں۔ اُس دن ان بدانیوں میں سے ایک بھی نہ تھی۔ کہ جب میری جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ اِس چھوکری نے موہنی ڈال دی۔ جیسی رُوح ویسے فرشتے مبارک ہو۔

یہ کہتی ہُوئی مالتی باہر نکلی۔ اُس نے سمجھا تھا۔ چرب زبانی اور حُسن کی طاقت سے وہ اِس دوشیزہ کو اُکھاڑ پھینکے گی۔ لیکن جب معلوم ہُوا کہ امرناتھ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ تو اُس نے اُسے بچھکار رہنا ہی۔ اِن داموں اگر امرناتھ مل سکتا۔ تو بُرا نہ تھا۔ اِس سے زیادہ قیمت وہ اُس کے لئے

نہ دے سکتی تھی۔

امرناتھ۔ اس کے ساتھ دروازے تک آئے۔ جب وہ تانگہ پر بیٹھی۔ تو منت کر کے بولے۔ یہ ساڑھی دیدو۔

مالتی:۔ میں کل تمہیں اس سے بدرجہا اچھی ساڑھی لادونگا۔

مالتی نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا، یہ ساڑھی تو اب لاکھ روپے پر بھی نہیں دے سکتی۔

امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔ اچھی بات ہے لے جاؤ۔ مگر یہ سمجھ لو۔ یہ میرا آخری تحفہ ہے۔

مالتی نے ہونٹ چبا کر کہا۔ اس کی پرواہ نہیں۔ تمہارے بغیر میں مر نہ جاؤنگی اس کا تمہیں یقین دلاتی ہوں۔

جیل

(۱)
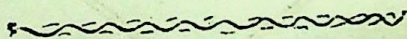
آنند نے گدے دار کرسی پر بیٹھ کر سگار جلاتے ہوئے کہا۔ آج دشوامبر نے کیسی حماقت کی۔ امتحان قریب ہے۔ اور آپ آج والنٹیر بن بیٹھے۔ کہیں پکڑے گئے۔ تو امتحان سے ہاتھ دھوئینگے۔ میرا تو خیال ہے، وظیفہ بھی بند ہو جائیگا۔

سامنے دوسرے کوچ پر روپ منی بیٹھی ایک اخبار دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اخبار کی طرف تھیں۔ مگر کان آنند کی طرف لگے ہوئے تھے۔ بولی یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ تم نے سمجھایا نہیں۔

آنند نے مُنہ بنا کر کہا۔ جب کوئی اپنے کو دُوسرا گاندھی سمجھنے لگے، تو اسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اُلٹا مجھے سمجھانے لگتا۔

رُوپ منی نے اخبار کو لپیٹ کر زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ تم نے

مجھے بھی تو نہیں بتایا۔ شائد میں اُسے روک سکتی۔

آنند نے کچھ چڑھ کر کہا۔ تو ابھی کیا ہُوا ہے۔ ابھی تو شائد کانگرس آفس ہی میں ہوگا۔ جا کر روک لو۔

آنند اور وشومبھر دونوں ہی یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ آنند کے حصہ میں لکشمی بھی پڑی تھی۔ سرسوتی بھی۔ وشومبھر پھُوٹی تقدیر لے کر آیا تھا۔ پروفیسروں نے مہربانی کر کے ایک چھوٹا سا وظیفہ دیدیا تھا۔ بس یہی اُس کے گزارے کی سبیل تھی۔ رُوپ منی بھی ایک سال قبل انہیں کی جماعت میں پڑھتی تھی۔ مگر اِس سال اُس کی صحت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اِس لئے اُس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا دونوں نوجوان کبھی کبھی اُس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ آنند آتا تھا۔ اُس کا دِل لینے کے لئے۔ وشومبھر آتا تھا۔ یُوں ہی دِل بہلانے کے لئے طبیعت پڑھنے میں نہ لگتی۔ یا جی گھبراتا تو وہ یہاں آ بیٹھتا تھا۔ شائد اُس سے اپنی مُصیبت کی داستان کہہ کر اُس کا دل سکوُن پا جاتا تھا۔ آنند کے سامنے کچھ اظہار درد کی اِس میں ہمت نہ تھی۔ آنند کے پاس اُن کے لئے ہمدردی کا ایک کلمہ شیریں بھی نہ تھا۔ وہ اِسے پھٹکارتا تھا۔ ذلیل کرتا تھا۔ اور بناتا تھا۔ وشومبھر میں اِس سے بحث کرنے کی قابلیت نہ تھی۔ آفتاب کے روبرو چراغ کی ہستی ہی کیا! آنند اُس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے اِس دماغی غلبہ کو پرے پھینکا تھا۔ اور اُسی کی شکائت لے کر آنند رُوپ منی کے پاس آیا تھا۔ مہینوں وشومبھر نے اپنے اندرُونی خیالات کو آنند کے خیالات میں جذب کرنے کی سعی کی۔ لیکن دلائل کی دُنیا میں شکست کھا کر بھی اُس کا دل بغاوت کرتا رہا۔ بلا شبہ اِس کا ایک سال ضایع ہو جائے گا ممکن ہے۔ اُس کی کالج کی زندگی کا سدا کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ پھر ان چودہ پندرہ سالوں کی محنت پر پانی پھر جائیگا۔ نہ خدا ہی ملے گا۔ نہ وصالِ صنم نصیب ہوگا

آگ میں کودنے سے حاصل؟ یونیورسٹی میں رہ کر بھی تو بہت کچھ ملک کا کام کیا جا سکتا ہے۔ آنند مہینے میں کچھ نہ کچھ چندہ جمع کر دیتا تھا۔ کچھ طلبا سے سودیشی کا عہد کرا لیتا تھا۔ وشومبھر کو بھی آنند نے یہی مشورہ دیا۔ اُس کی دلیلوں نے وشومبھر کی عقل کو جیت لیا۔ لیکن اِس کے دل کو نہ جیت سکا۔ آج جب آنند کالج گیا تو وشومبھر نے سوراج بھون کی راہ لی۔ آنند کالج سے لوٹا، تو اُسے اپنی میز پر وشومبھر کا خط ملا۔ لکھا تھا۔

پیارے آنند! مجھے بخوبی علم ہے۔ کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں، وہ میرے لئے فائدہ بخش نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے۔ کون سی قوت مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے میں جانا نہیں چاہتا، لیکن جاتا ہوں۔ اِسی طرح، جیسے آدمی مرنا نہیں چاہتا لیکن مرتا ہے۔ رونا نہیں چاہتا۔ لیکن روتا ہے۔ جب وہ سبھی لوگ جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے۔ اوکھلی میں اپنا سر ڈال چکے، تو میرے لئے بھی اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یونیورسٹی کی ڈگری اچھی شے ہے۔ لیکن خدمتِ وطن کا تمغہ اِس سے کہیں اچھا ہے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔

تمہارا وشومبھر

خط پڑھ کر آنند کے جی میں آیا۔ کہ وشومبھر کو سمجھا بجھا کر لوٹا لائے۔ مگر اِس کی حماقت پر غصہ آیا۔ اور اِسی طیش میں وہ روپ منی کے پاس جا پہنچا۔ اگر روپ منی اِس کی خوشامد کر کے کہتی۔ جا کر اُسے لوٹا لاؤ۔ تو شائد وہ چلا جاتا پر اُس کا یہ کہنا کہ میں اُسے روک لیتی، اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اُس کے جواب بن ناراضی تھی۔ سرد مہری تھی اور شائد کسی قدر حسد بھی تھا۔

روپ منی نے ادائے غرور سے اُسکی طرف دیکھا، اور بولی۔ اچھی بات ہے،۔

میں جاتی ہوں۔ پھر اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ تم کیوں نہیں چلتے ؟

پھر وہی غلطی۔ اگر رُوپ منی اس کی خوشامد کر کے کہتی۔ تو آنند ضرور اس کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن اُس کے سوال میں پہلے ہی یہ اندیشہ چھپا تھا۔ کہ آنند جانا نہیں چاہتا۔ معزور آنند اس طرح نہیں جا سکتا۔ اُس نے اُداس ہو کر جواب دیا۔ میرا جانا لاحاصل ہے۔ تمہاری باتوں کا زیادہ اثر ہوگا۔ وہ میرے میز پر یہ خط چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ رُوح، اور فرض، اور معراج کی بڑی بڑی باتیں سوچ رہا ہے۔ اور اپنے آپ کو بھی آسمان کا باشندہ تصور کرتا ہے تو میرا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس نے جیب سے خط نکالکر روپ منی کے سامنے رکھدیا۔ ان الفاظ میں جو اشارہ اور طعن تھا اس نے ایک لمحے تک روپ منی کو اسکی طرف دیکھنے نہ دیا۔ آنند کے اس ظالمانہ حملے نے اُسے جیسے ہلاک کر دیا۔ پھر ایک ہی لمحہ میں سرکشی کی ایک چنگاڑی سی اُس کے اندر جا گھسی۔ اُس نے نہایت سکون سے خط کھول کر پڑھا۔ پڑھا صرف آنند کے حملہ کا جواب دینے کے لئے۔ لیکن پڑھتے پڑھتے اُس کا چہرہ جیسے چمکنے لگ گیا۔ گردن تن گئی، آنکھوں میں ایثار کی سُرخی آگئی۔

اُس نے خط کو میز پر رکھ دیا۔ اور بولی۔ نہیں اب میرا جانا بھی بیکار ہے۔

آنند نے اپنی جیت پر خوش ہو کر کہا۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا۔ اِس وقت اُس کے سر پر بھوت سا سوار ہے۔ اُس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہ ہوگا۔ جب سال بھر جیل میں چکی پیس لیگا۔ اور وہاں سے تپدق لے کر نکلیگا۔ یا پولیس کے ڈنڈے سے سر اور ہاتھ پاؤں تڑوا لیگا۔ تو عقل ٹھکانے آئیگی۔ ابھی تو جے اور تالیوں کے خواب دیکھ رہا ہوگا۔ رُوپ منی سامنے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اُسے نیلے آسمان میں بادل کی ایک تصویر سی نظر آئی۔ کمزور۔ دُبلی پتلی۔ برہنہ جسم، گھٹنوں تک دھوتی۔ چکنا سر۔ پوپلا منہ۔ عبادت، ایثار اور صداقت کی زندہ مورت۔

آنند نے پھر کہا۔ اگر تمھیں یقین ہو۔ کہ میرے خون سے ملک بیدار ہو جائیگا۔ تو میں اپنا خون دینے کو آج تیار ہوں۔ لیکن میرے جیسے سو پچاس آدمی نکل ہی آئے، تو کیا ہوگا۔ جان دیدینے کے علاوہ اور تو کچھ نتیجہ نظر نہیں آتا۔

رُوپ منی۔ اب بھی، وہی بادل کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اُس کا وہ تبسم وہ سادہ، دلفریب مُسکراہٹ جس نے کائنات کو جیت لیا ہے۔ آنند پھر بولا۔ جن حضرات کو امتحان کا بھوت ستایا کرتا ہے۔ انہیں خدمتِ وطن کی سوجھتی ہے کوئی پوچھے آپ اپنی خدمت تو کر نہیں سکتے۔ وطن کی کیا خدمت کرینگے۔ اِدھر فیل ہونے کی نسبت اُدھر کے ڈنڈے بھی ہلکے ہیں۔

رُوپ منی کی آنکھیں اب بھی آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

آنند نے جیسے چونک کر کہا۔ ہاں آج بڑا پُر لطف فلم ہے۔ چلتی ہو۔ پہلے شو میں دیکھ آئیں

رُوپ منی نے گویا آسمان سے نیچے اُتر کر جواب دیا۔ نہیں میرا جی نہیں چاہتا

آنند نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ کیوں طبیعت تو اچھی ہے۔

روپ مُنی نے ہاتھ چھُڑانے کی کوشش نہ کی۔ بولی۔ ہاں طبیعت کو کیا ہُوا ہے۔

آنند۔ تو چلتی کیوں نہیں؟

رُوپ منی۔ آج جی نہیں چاہتا۔

آنند۔ تو پھر میں بھی نہ جاؤنگا۔

رُوپ منی۔ نہائت نیک خیال ہے۔ ٹکٹ کے دام کسی کارِ خیر میں دیدو۔

آنند۔ یہ تو ٹیڑھی شرط ہے۔ مگر منظور

روپ منی۔ کل رسید مجھے دکھا دینا۔

آنند۔ نہیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں۔
وہ کچھ بیدل ہو کر ہوسٹل چلا گیا۔ ذرا دیر بعد روپ منی سوراج بھون کیطرف چلی۔

(۲)

روپ منی سوراج بھون پہنچی۔ تو والنٹیروں کی ایک جماعت بدیسی کپڑوں کے گوداموں پر دھرنا دینے جا رہی تھی۔ وشومبھر اس جماعت میں نہ تھا۔ دوسری جماعت شراب کی دوکانوں پر جانے کو تیار تھی۔ وشومبھر اس میں بھی نہ تھا۔
روپ منی نے سکرٹری کے پاس جا کر کہا۔ آپ بتا سکتے ہیں۔ وشومبھر کہاں ہیں؟
سکرٹری۔ کون وشومبھر؟ وہی جو۔ آج ہی بھرتی ہوئے ہیں۔
روپ منی۔ جی ہاں وہی۔
سکرٹری۔ بڑا دلیر آدمی ہے۔ اس نے دیہاتوں میں کام کرنے کا ذمہ لیا ہے اسٹیشن پر پہنچ چکا ہوگا۔ سات بجے کی گاڑی سے جا رہا ہے۔
روپ منی:۔ تو ابھی اسٹیشن پر ہونگے؟
سکرٹری نے گھڑی پر نظر ڈال کر جواب دیا۔ ہاں ابھی تو شاید سٹیشن پر ملجائیں
روپ منی نے باہر نکل کر سائیکل تیز کی۔ سٹیشن پر پہنچی۔ تو دیکھا وشومبھر پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ روپ منی کو دیکھتے ہی اس کے پاس چلا آیا۔ اور بولا۔ تم یہاں کیسے آگئیں۔ آج آنند سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟
روپ منی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔ یہ تم نے کیا صورت بنا لی ہے۔ کیا پاؤں میں جوتا پہننا بھی حبّ وطن کے خلاف ہے۔
وشومبھر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا آنند بابو نے تم سے کچھ کہا نہیں؟
روپ منی نے جواب دیا۔ جی ہاں کہا ہے۔ نہیں یہ کیا سوجھی ہے۔ دو سال سے

کم کے لئے نہ جاؤگے۔ اتنا سوچ لو۔

دشومبھر کا مُنہ اُتر گیا۔ بولا۔ جب یہ جانتی ہو۔ تو کیا تمہارے پاس میری ہمت بڑھانے کو دو۔ لفظ بھی نہیں ہیں۔

رُوپ منی کا دل مسوس اُٹھا، مگر اُس نے ظاہر نہ کیا۔ بولی۔ تم مجھے دشمن سمجھتے ہو یا دوست؟

دشومبھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ تم ایسا سوال کیوں پوچھتی ہو۔ رُوپ منی! اِس کا جواب میرے مُنہ سے سُنے بغیر بھی تم کہہ سکتی ہو۔ کہ میرا جواب کیا ہوگا۔

رُوپ منی:۔ تو میرا مشورہ یہ ہے کہ مت جاؤ۔ اب بھی لوٹ چلو۔

دشومبھر:۔ یہ دوست کا مشورہ نہیں ہے روپ منی! مجھے یقین ہے۔ یہ بات تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ ذرا سوچو میری جان کی قیمت کیا ہے۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت۔ بہت بڑھا تو تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا۔ اِس کے بدلے یہاں کیا ملیگا۔ جانتی ہو۔ سارے مُلک کے لئے سوراج۔ اتنے عظیم الشان مقصد کے لئے مرجانا بھی اِس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔ اب جاؤ۔ گاڑی آرہی ہے۔ آنند بابو سے کہنا، مجھ سے ناراض نہ ہوں

رُوپ منی نے آج تک اِس کُند ذہن نوجوان پر رحم کیا تھا۔ اس وقت اِسے اُس سے عقیدت ہو چلی۔ ایثار میں دل کو کھینچنے کی جو قوت ہے۔ رُوپ منی کو اُس نے زور سے کھینچا۔ پھر ناموافق حالات کا تفاوت مٹ سا گیا۔ دشومبھر میں جس قدر خامیاں تھیں، وہ سب خوبیاں بن کر چمک اُٹھیں۔ اُس کے دل کی وسعتوں میں وہ کسی پنچھی کے مانند اُڑ اُڑ کر گوشہ عافیت تلاش کرنے لگی۔

رُوپ منی نے اُس کی طرف عقیدتمندانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔

وشومبھر کو جیسے گھڑ دل نشہ چڑھ گیا۔ بولا تم کو! آنند بابو مجھے زندہ نہ چھوڑینگے۔

رُوپ منی:۔ میں آنند بابو کے ہاتھوں بکی نہیں ہوں۔

وشومبھر:۔ آنند تو تمہارے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔

رُوپ منی نے سرکش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ پر کچھ بولی نہیں ماحول اُسے اِس وقت پاؤں کی بیڑیاں معلوم ہو رہے تھے۔ کاش وہ بھی وشومبھر کے مانند آزاد ہوتی۔ امیر والدین کی اکلوتی لڑکی، نازو نعمت میں پلی ہوئی اس وقت اپنے آپ کو قید سمجھ رہی تھی۔ اُس کی رُوح ان بندشوں کو توڑنے کے لئے پھڑپھڑانے لگی۔

گاڑی آگئی، مُسافر اُترنے لگے۔ رُوپ منی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ تم مجھے نہیں لے چلوگے؟

وشومبھر نے مُستقل مزاجی سے جواب دیا۔ نہیں۔

رُوپ منی۔ کیوں

وشومبھر:۔ میں اس کا جواب دینا نہیں چاہتا۔

رُوپ منی:۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ میں دیہات میں رہ نہ سکوں گی۔

وشومبھر:۔ نادم ہو گیا۔ یہ بھی ایک بڑا سبب تھا۔ مگر اُس نے انکار کر دیا نہیں یہ بات تو نہیں ہے رُوپ منی

رُوپ منی۔ تو پھر کیا بات ہے۔ کیا یہ اندیشہ ہے۔ کہ والد صاحب مجھے گھر سے نکال دینگے؟

وشومبھر۔ اگر یہ اندیشہ ہو تو کیا یہ کم ہے۔

رُوپ منی۔ میں اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتی۔ ایک تنکے برابر بھی نہیں۔

وشومبھر نے دیکھا، رُوپ منی کے چاند سے چہرے پر آہنی ارادہ کی روشنی چمک رہی تھی۔ وہ اِس ارادے کے سامنے کانپ اُٹھا۔ بولا۔ میری یہ درخواست قبول کرلو۔ رُوپ منی! میں تم سے یہ منت کرتا ہوں۔

رُوپ منی سوچنے لگی۔

وشومبھر نے پھر کہا۔ میری خاطر تمہیں یہ ارادہ ترک کردینا ہوگا۔

رُوپ منی سر جھکا کر بولی۔ اگر یہ تمہارا حکم ہے۔ تو میں اس کی تعمیل کرونگی۔ وشومبھر! تم شائد دل میں سمجھتے ہوگے۔ یہ عارضی جوش میں آکر اِس وقت مُستقبل کو غارت کرنے جارہی ہے۔ میں ثابت کردوں گی۔ یہ میرا عارضی جوش نہیں ہے۔ بلکہ مُصیبتوں میں بھی قائم رہنے والا عزم ہے۔ جاؤ مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ قانون کے پنجہ میں ایسی وقت آنا۔ جب تمہاری اصول پرستی پر حرف آتا ہو۔ میں تمہاری کامیابی کے لئے پرارتھنا کرتی رہونگی۔

گارڈ نے سیٹی دی۔ وشومبھر اندر جا بیٹھا۔ گاڑی چلی گئی۔ رُوپ منی گویا کائنات کی دولت آنچل میں لئے کھڑی رہی۔

(۳)

روپ منی کے پاس وشومبھر کا ایک پرانا بوسیدہ سا فوٹو الماری کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ آج سٹیشن سے لوٹ کر اُس نے اُسے نکالا۔ اور اُسے ایک خوبصورت فریم میں لگا کر میز پر رکھ دیا۔ آنند کا فوٹو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

وشومبھر نے تعطیلوں میں اُسے دو چار خطوط لکھے تھے۔ رُوپ منی نے اُنہیں پڑھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آج اُس نے ان خطوط کو

نکالا۔ اور انہیں دوبارہ پڑھا۔ اُن خطوط میں آج کیسی حلاوت تھی۔
رُوپ منی نے انہیں نہائت حفاظت سے رائٹنگ بکس میں بند کر دیا۔

دُوسرے دن اخبار آیا۔ تو رُوپ منی اس پر ٹوٹ پڑی۔ وشومبھر کا نام دیکھ کر وہ مسرّت سے پھُول اُٹھی۔ دن میں ایک مرتبہ سوراج بھون جانا اس کا معمول ہو گیا۔ جلسوں میں بھی برابر شریک ہوتی۔ عیش و آرام کی تمام اشیاء ایک ایک کر کے پھینک دیں۔ ریشمی ساڑھیوں کی جگہ گاڑھے کی ساڑھیاں آئیں۔ چرخہ بھی آیا۔ وہ گھنٹوں بیٹھی سوت کاتا کرتی۔ اُس کا سُوت روز بروز باریک ہوتا جاتا تھا۔ اِسی سُوت سے وہ وشومبھر کے کرتے بنائیگی۔

اِس زمانہ میں امتحان کی تیاریاں تھیں۔ آنند کو پھر اُس سے ملنے کی فرصت نہ ملی۔ دو ایک مرتبہ وہ آیا۔ لیکن زیادہ دیر بیٹھا نہیں۔ شائد رُوپ منی کی سرد مہری نے اُسے نہ بیٹھنے دیا ہو۔

ایک مہینہ بیت گیا۔

ایک دن شام کو آنند آیا۔ رُوپ منی سوراج بھون جانے کو تیار تھی۔ آنند نے بھویں سکوڑ کر کہا۔ تم سے تو اب بات کرنا بھی مشکل ہے۔

رُوپ منی نے کُرسی پر بیٹھ کر جواب دیا۔ تمہیں بھی تو کتابوں سے چھٹی نہیں ملتی۔ آج کی کچھ تازہ خبر نہیں ملی۔ سوراج بھون میں روز روز کی خبریں مِل جاتی ہیں۔

آنند نے فلاسفروں کی سی افسردگی سے کہا۔ وشومبھر نے تو سُنا ہے دیہاتوں میں خوب شور و غل مچا رکھا ہے۔ جو کام اس کے لائق تھا۔ اُسے مِل گیا۔ یہاں اس کی زبان نہ کھلتی تھی۔ وہاں دیہاتوں میں خوب گرجتا

ہوگا۔ مگر آدمی من چلا ہے۔

رُوپ منی نے اِس کی طرف ایسی نگاہوں سے تاکا جو کہ رہی تھیں تم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اور بولی۔ آدمی میں اگر یہ خوبی ہے۔ تو دوسرے سارے عیب مٹ جاتے ہیں۔ تمہیں قومی خبریں پڑھنے کو کب فرصت ملتی ہوگی۔ وشومبھر نے گاؤں میں ایسی بیداری پیدا کر دی ہے۔ کہ بدیسی کپڑے کا ایک تار بھی نہیں بکنے پاتا۔ نہ کوئی نشہ کی دو کانوں پر جاتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ پکٹنگ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اب قومی پنچائیتیں کھول رہے ہیں۔

آنند نے بے پروائی سے کہا۔ تو سمجھ لو۔ اب اُس کے چلنے کے دن بھی آگئے۔

رُوپ منی نے جوش سے جواب دیا۔ اتنا کام کر کے جانا بہت سستا نہیں ہے۔ کل تو وہاں ایک بہت بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ پرگنہ بھر کے لوگ جمع ہوئے ہونگے۔ سُنا ہے آجکل دیہاتوں سے کوئی مُقدّمہ نہیں آتا۔ وکیلوں کی نانی مری جا رہی ہے۔

آنند نے قدرے جوش سے کہا۔ یہی تو سوراج کا مزہ ہے۔ کہ زمیندار وکیل اور بیوپاری سب مریں۔ صرف مزدور اور کسان رہ جائیں۔

رُوپ منی نے سمجھ لیا۔ آج آنند تُل کر آیا ہے۔ اُس نے بھی جیسے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ تو کیا چاہتے ہو۔ کہ زمیندار اور وکیل اور بیوپاری غریبوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے چلے جائیں۔ اور کوئی زبان نہ کھولے

آنند گرم ہو کر بولا۔ علم اور دولت کی حکمرانی ہمیشہ رہی ہے۔ اور ہمیشہ رہیگی۔ ہاں اِس کی صورت بدل سکتی ہے۔

رُوپ منی نے جوش سے کہا۔ اگر سوراج ملنے پر بھی دولت کو ہی جگہ ملے۔ اور تعلیم یافتہ لوگ سوسائٹی میں اسی طرح غرض کے اندھے بنے رہیں۔ تو سُوراج کا نہ ملنا اچھا۔ اُمراء کے تمول اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود غرضیوں نے ہمیں پیس ڈالا ہے۔ جن برائیوں کو رفع کرنے کے لئے آج ہم جان کو ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں۔ انہی بُرائیوں کو کیا ہم اِس لئے سر پر چڑھا لینگے۔ کہ وہ بدیشی نہیں سودیشی ہیں۔ کم از کم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں۔ کہ جان کی جگہ گوبند آ بیٹھے۔ میں سوسائٹی کی ایسی حالت دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی پیٹ بھر کر کھانا میسّر آ سکے۔

آنند:۔ یہ تمہاری ذاتی رائے ہو گی۔

رُوپ:۔ تم نے ابھی اِس تحریک کا لٹریچر پڑھا ہی نہیں ہے۔

آنند:۔ نہ پڑھا ہے نہ پڑھنا چاہتا ہوں۔

رُوپ:۔ نہ پڑھو۔ اِس سے مُلک کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے۔

آنند:۔ تم تو جیسے وہ رہی ہی نہیں۔ بالکل کایا پلٹ ہو گئی۔

اتنے میں چھوٹی رمان نے اخبار لا کر میز پر رکھ دیا۔ رُوپا نے بے صبری سے اُسے کھولا۔ پہلے عنوان پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں جیسے نشہ چھا گیا۔ گردن خود بخود تن گئی۔ اور چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور برسنے لگا۔ اس نے جوش سے کھڑی ہو کر کہا۔ دشومبھر گرفتار ہو کر دو سال کے لئے جیل چلے گئے۔

آنند نے افسردگی سے پوچھا۔ کس معاملہ میں؟

رُوپ منی نے دشومبھر کے فوٹو کی طرف تاکتے ہوئے۔ کہا رانی ز

میں جلسہ تھا۔ وہیں پکڑے گئے ہیں۔
آنند:۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ دو سال کے لئے جائینگے۔ زندگی خراب کر ڈالی۔
رُوپ منی نے سرد مہری سے کہا۔ کیا ڈگری لے لینے سے ہی آدمی کی زندگی شاندار بنتی ہے۔ کیا سارا علم، سارا تجربہ کتابوں ہی میں بھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے۔ انسانی فطرت کا جس قدر عملی تجربہ وشومبھر کو دو سال میں ہو جائیگا اُتنا تجربہ فلسفہ اور منطق کی کتابوں سے نہیں دو سال میں بھی نہ ہوگا۔ اگر تعلیم کا مقصد کیریکٹر ہے۔ تو ملکی تحریک میں اسکے جس قدر ذرائع ہیں۔ وہ پیٹ کی لڑائی میں کبھی نہیں ہو سکتے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو۔ کہ ہمارے لئے پیٹ کی فکر ہی بہت ہے۔ تو میں مان لونگی۔ لیکن ملک و قوم کی خدمت کرنے والوں کو بیوقوف بنانا میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔
آنند۔ آج وشومبھر کو مُبارکباد دینے کے لئے جلسہ ہوگا۔ جاؤگی۔
رُوپ منی نے خود سرانہ انداز میں کہا۔ ضرور جاؤنگی۔ میں تو لیکچر بھی دُونگی کل رانی گنج چلی جاؤں گی۔ وشومبھر نے جو چراغ روشن کیا ہے۔ میری زندگی میں بجھنے نہ پائیگا۔
آنند نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح تنکے کا سہارا لیا۔ اپنے والدین سے بھی پوچھا؟

رُوپ :۔ پوچھ لوں گی۔ آنند:۔ اور وہ تمہیں اجازت دیدینگے
رُوپ۔ اصول کے سامنے کسی کی اجازت کیضرورت ہی نہیں پڑتی۔
آنند:۔ اچھا! یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ یہ کہتا ہوا آنند اُٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اُس وقت اسکے پیر اس طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ جیسے اب گرا۔ اب گرا۔

وفا کی دیوی

(۱)

ماگھ کا مہینہ۔ صُبح کا وقت۔ ہردوار میں گنگا کا کنارہ۔ اسنان کا میلہ۔ صبح کی زرّیں شعاعوں میں سامنے کی پہاڑیاں نہائی کھڑی ہیں۔ جاتریوں کا اتنا ہجوم ہے۔ کہ کھوے سے کھوا اچھلتا ہے۔ جا بجا سادھو سنتوں اور بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اسی وقت سانگلی کے کنور صاحب اور اُن کی رانی اسنان کرنے آتے ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی چھ سال کی لڑکی بھی ہے۔ کنور صاحب کے سر پیچ پُوری پگڑی نیچی اچکن، امرتسری جوتے بڑی بڑی مونچھیں، تناور جسم۔ رانی گندمی رنگ نازک بدن عورت زیورات سے لدی ہوئی۔ لڑکی بھی زیور پہنے ہوئے ہے۔ اُن کے ساتھ کئی سپاہی پیادے، بھالے بلّم لئے وردیاں پہنے چلے آرہے ہیں۔ کئی خدمتگار بھی ہیں جو لوگ ہجوم کو ہٹاتے دریا کے کنارے پہونچکر اشنان کرتے ہیں۔

رانی کے اشنان کے لیئے چار آدمی پردے کرتے ہیں۔.......

.... لڑکی پانی سے کھیل رہی ہے۔ راجہ صاحب

پنڈوں کو دان دے رہے ہیں۔ اور لڑکی اپنی کشتی پانی میں تیرا رہی ہے۔ یکایک کشتی ایک ریلے میں بہہ جاتی ہے۔ لڑکی اُسے پکڑنے کے لیئے لپکتی ہے۔ اسی وقت آدمیوں کا ایسا ریلا آتا ہے۔ کہ لڑکی ماں باپ سے الگ ہو جاتی ہے۔ کبھی ادہر بھاگتی، کبھی اُدھر۔ بار بار اپنے ماں باپ کو دیکھنے کا دہوکا ہوتا ہے۔ پھر وہ رونے لگتی ہے۔ مارے خوف کے کسی سے کچھ بولتی نہیں نہ راستہ پوچھتی ہے۔ کھڑی پھُوٹ پھُوٹ رو رہی ہے۔ اور رہ رہ کر اپنی ماں کو پکارتی ہے۔ یکایک ایک رستہ دیکھ کر اُسے اپنے قیام گاہ کے راستے کا گمان ہوتا ہے۔ اُسی پر ہو لیتی ہے۔ مگر وہ راستہ اُسے اسکے دھرم شالے سے دُور لیئے جا رہا ہے۔

ادھر کنور صاحب اور اُن کی رانی لڑکی کو نہ پا کر اِدھر ادھر تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بدحواس ہو کر اپنے ملازموں پر بگڑتے ہیں۔ ملازم لڑکی کی تلاش میں چلے جاتے ہیں۔ رانی ایک چھوٹی لڑکی کو دیکھ کر بے اختیار۔ اُس کی طرف دوڑتی ہے۔ مگر جب اپنی غلطی ظاہر ہوتی ہے۔ تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب غصّے سے آگ ہو رہے ہیں، مگر کہیں تلاش کرنے نہیں جاتے۔ ابھی ان کا صافا ٹھیک نہیں ہوا۔ اچکن بھی سجل نہیں ہوئی بال بھی نہیں سنوارے جا سکے۔ نوکر تو اب وہاں رہے نہیں۔ تب وہ پنڈوں پر بگڑتے ہیں۔ اور ہاں آخر تک سنگھار سے درست ہو کر وہ کمر میں تلوار لگا کر لڑکی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اِسی اثنا میں رانی نے گنگا کے کنارے آکر منت مانی ہے۔ ہجوم کے مارے ایک ایک قدم چلنا مشکل ہے۔

ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ بیچارے غم نصیب ماں باپ دھکے میں کبھی دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ کبھی دس قدم پیچھے چلے جاتے ہیں۔

ادھر لڑکی روتی ہوئی اپنے دھرم شالے کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہوئی دور چلی جا رہی ہے۔

دفعتہً کنور صاحب کو خیال آتا ہے۔ کہ شاید لڑکی دھرم شالے میں پہنچ گئی ہو۔ نوکروں نے اُسے پا لیا ہو۔ دونوں فوراً بھیڑ کو ہٹاتے ہوئے دھرم شالے کی طرف چلتے ہیں۔ مگر وہاں پہنچکر دیکھتے ہیں۔ تو لڑکی کا پتہ نہیں۔ دونو پھر گھبرا کر نکل پڑتے ہیں۔ دل لگی یہ ہے۔ کہ آگے آگے لڑکی روتی چلی جاتی ہے پیچھے پیچھے ماں باپ اُس کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ بیچ میں صرف بیس گز کا فاصلہ ہے۔ مگر دونوں میں مٹ بھیڑ نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ گھنٹوں گذر جاتے ہیں بادل گھر آتا ہے۔ رانی تھک جاتی ہے۔ اس سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا وہ سڑک کے کنارے بیٹھ جاتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب لال لال آنکھیں نکالے، حواس باختہ، ساری دُنیا پر جھلائے ہوئے ہیں۔

راجکماری مایوس ہو کر پھر ہردوار گھاٹ کی طرف چلتی ہے۔ اور ماں باپ کے سامنے سے نکل جاتی ہے۔ مگر دونوں کی نگاہیں۔ دوسری طرف ہیں۔ آنکھیں چار نہیں ہوتیں۔

اتنے میں ایک جٹا دھاری مہاتما کندھے پر مرگ چھالا ڈالے ظروف ہاتھ میں لئے چلے آرہے ہیں۔ راجکماری کو گھبرایا دیکھ کر وہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو گئی ہے۔ اُسے گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ اور اُس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھتے ہیں۔ لڑکی نہ اپنے والدین کا نام بتلا سکتی ہے، نہ اپنے گھر کا پتہ۔ وہ صرف رو رہی ہے۔ مارے خوف کے آنسو

کی زبان ہی نہیں کھلتی۔

اب سادھو کے دل میں ایک نئی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ لڑکی کو گود میں لئے کھڑے سوچ رہے ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اُن کا دل کہتا ہے۔ جب اِس کے والدین کا پتہ ہی نہیں۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اُن کا نفس اِس لڑکی کو چھپا رکھنے کی تحریک کرتا ہے۔ وہ راجکماری کو لئے اپنے کُٹی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اُن کی لڑکی اور بیوی دونوں مر چکی ہیں۔ اِسی غم میں وہ دُنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اِس چاند سی لڑکی کو پا کر ان کے دل میں پھر محبت پدری تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ پرماتما نے ان پر رحم کھا کر یہ مشعل اُن کی زندگی کو روشن کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

(۲)

ایک کوہستانی مقام میں ایک صاف ستھری، بیلوں اور پھولوں سے آراستہ کُٹی ہے۔ پُشت کی طرف بہت گہرائی میں ایک دریا بہہ رہا ہے کُٹی کے سامنے چھوٹا سا میدان ہے۔ اُس میں طرح طرح کے پھول لگے ہیں۔ بغل میں گائے بندھی ہوئی ہے۔ دو ہرن اور دو مور میدان میں پھر رہے ہیں۔ وہی مہاتما کُٹی کے سامنے ایک چٹان پر بیٹھے طنبورے پر گا رہے ہیں۔ راجکماری بھی اُن کے سر میں سُر ملا کر گا رہی ہے۔ اُس کی عمر اب دس سال کی ہو گی۔ بھجن گا چکنے کے بعد لڑکی پھول چُننے لگتی ہے۔ اور ایک مالا بناتی ہے پھر کُٹی میں جا کر ٹھاکر جی کو اشنان کراتی ہے۔ سادھو بھی آ جاتے ہیں۔ اور وہ دونوں ٹھاکر جی کی اُستت کرتی ہیں۔ پھر وہ وجد میں آ کر ناچنے لگتے ہیں۔ ذرا دیر بعد لڑکی بھی رقص کرنے لگتی ہے۔ کیرتن ختم ہو جانے کے بعد دونوں چرنامرت

لیتے ہیں۔ اور سادہو راجکماری کو (جس کا نام اِندرا رکھا گیا ہے) پڑھلانے لگتے ہیں۔ اُنہیں اسکو گانا بجانا ناچنا سکھانے اور پڑھانے میں رُوحانی لطف حاصل ہوتا ہے۔ اُن کی دلی آرزو ہے۔ کہ اندرا ایشور بھجن اور دُنیا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کرے۔ وہ اُس مُبارک دن کا خواب دیکھتے ہیں۔ جب اندرا ٹھاکرجی کے سامنے میرا کی طرح گائیگی۔ اور وجد میں آکر ناچیگی۔ اندرا اتنی حسین، اتنی خوش گلو اور رقص کرنے میں اتنی مشاق ہے۔ کہ جب رات کو وہ کیرتن کرنے لگتی ہے۔ تو بھگتوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

مہاتماجی نے یہ پانچسال اُسی کُٹی میں کاٹے ہیں۔ اب اندرا سفر کی تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ اِس لئے اب سادہو تیرتھ جاترا کرنے نکلتے ہیں۔ بھگت لوگ اُنہیں رخصت کرنے آتے ہیں۔ ایک بھگت کو وہ کُٹی سپرد کر دی جاتی ہے۔ اور مہاتما اندرا کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں۔

مہاتماجی برسوں تک تیرتھ استھانوں کی جاترا کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بدری ناتھ جاتے ہیں، کبھی کیدار ناتھ، کبھی دوارکا، کبھی رامیشور، کبھی متھرا کبھی کاشی، کبھی پُری، ہر ایک جگہ مندر میں دونوں کیرتن کرتے ہیں۔ اور عقیدت مندوں کو معرفت کے نشہ سے متوالا کر دیتے ہیں۔ اب مہاتماجی اندرا کو شاستر اور وید کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اکثر جب مہاتما دھیان میں مگن ہو جاتے ہیں۔ تو اندرا ویدوں کا مُطالعہ کرتی ہے۔

(۳)

ایک دن مہاتماجی اور اِندرا دونوں ایک گاؤں میں جا پہنچتے ہیں مسلمانوں کا گاؤں ہے۔ ایک ہفتہ سے طاعون پھیلا ہوا ہے گاؤں کے باہر لوگ

جھونپڑیاں ڈالے پڑے ہیں۔ مہاتما جی ایک درخت کے نیچے آسن جملتے ہیں۔ اور طاعون زدوں کا معالجہ کرتے ہیں۔ جان ہتھیلی پر لئے ہوئے وہ مریضوں کی تیمارداری اور خدمت کرتے ہیں۔ اندرا بھی عورتوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرنا، دوائیں بنانا، مریضوں کو اٹھانا بٹھانا اُن کے بچوں کے لئے کھانے پینے کی فکر کرنا، ان دونوں کا روزمرہ کا کام ہے۔ یہاں تک کہ مہاتما جی کو طاعون ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُسی درخت کے نیچے پڑ جاتے ہیں۔ گاؤں میں بیماری بہت کم ہو گئی ہے زیادہ تر لوگ اچھے ہو گئے ہیں۔ اس گاؤں کے سبھی زن و مرد اور قرب و جوار کے مواضعات کے لوگ مہاتما جی کی تیمارداری کے لئے آتے ہیں۔ لیکن مہاتما جی کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک دن وہ اِندرا کو بلا کر ایشور بھجن اور عوام الناس کی خدمت کا اپدیش کر کے ٹھاکر جی کے چرنوں کا دھیان کرتے ہوئے سمادھی لے لیتے ہیں۔ گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ مہاتما جی کی ارتھی، دھوم دھام باجے گاجے کے ساتھ نکلتی ہے۔ بھجن گانے والوں کی ایک منڈلی بھی ساتھ ہے۔ گاؤں کا چکر لگانے کے بعد اسی درخت کے سایہ میں ان کی چھتری بنتی ہے۔

اندرا کی عمر اِس وقت بیس اکیس سال کی ہے اسکے چہرے پر ایسا جلال ہے۔ کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ اس کی مضبوط جسم ہر ایک قسم کی سختیاں جھیلنے کا عادی ہو گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ چاہتے ہیں۔ کہ وہ اِسی گاؤں میں رہے۔ مگر اِس سے اب اپنے محسن کی جدائی نہیں برداشت ہوتی جس گاؤں میں اُس پر یہ مصیبت پڑی۔ اس میں وہ اب نہیں رہ سکتی۔ وہ دل کو اِس خیال سے تسکین دینا چاہتی ہے۔ کہ ایشور کو جو کچھ منظور تھا۔ وہ ہوا۔

مگر کسی طرح تسکین نہیں ہوئی۔ آخر ایک دن وہ سب سے رخصت ہو کر نکل پڑتی ہے
اس کی کمر میں چھپی ہوئی کٹار ہے۔ ہاتھ میں طنبورا اور کمنڈل اور کندھے پر
مرگ چھالا۔

وہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر ایشور کے بھجن سناتی اور عوام کے دلوں
میں بھگتی اور سیوا کی شمع جلاتی پھرتی ہے۔ وہ جس شہر میں جا پہنچتی ہے۔ بات کی
بات میں ہزاروں آدمی آجاتے ہیں۔ اسکی سواری کے لئے موٹریں، رہنے کے
لئے محلات، کھلانے کے لئے بہترین نعمتیں پیش کی جاتی ہیں۔ مگر وہ نمائش اور
تکلف کو حقیر سمجھتی ہوئی کسی مندر کے سامنے درخت کے سایہ میں ٹھہرتی ہے
اور جو کچھ روکھا سوکھا میسر آجاتا ہے۔ کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتی ہے۔ اس کی
آنکھوں میں وہ موہنی، اداؤں میں وہ کشش ہے۔ کہ لوگ اس کے منہ سے ایک
ایک لفظ سننے کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ بڑے بڑے عیاش اور رنگین
مزاج اسکے درشن کرتے ہی عقیدت سے اسکے سامنے سر جھکا دیتے
ہیں۔ اندرا کو صوفی شعرا کا کلام بہت پسند ہے۔ میرا، کبیر وغیرہ کو وہ بڑے
شوق سے پڑھتی ہے۔ اور انہیں کے بھجن گاتی ہے۔ تلسی اور سورداس
کے پدوں سے بھی اُسے عشق ہے۔ حال کے شعرا میں اسے جس کا کلام سب
سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ ہری ہر نام کا ایک شاعر ہے۔ وہ اس کے گیتوں کو
پڑھ کر متوالی ہو جاتی ہے۔ اُس کے لئے اس کے دل میں خاص احترام
ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کہیں ہری ہر سے ملاقات ہو جاتی۔ تو وہ اس کے قدموں
کو بوسہ دیتی

(۴)

جموں ریاست کا خاص شہر۔ کوہستانی علاقہ۔ صاف ستھری سڑکیں، صاف ستھرے آدمی۔ عالیشان محلات۔ ایک نہایت خوشنما چوک۔ چاروں طرف روشنی سے جگمگاتی ہوئی دکانیں۔ وسط میں ایک پارک، پارک میں فوارہ۔ اندرا اسی فوارے کے سامنے کھڑی طنبورے پر بھجن گا رہی ہے۔ ہزاروں آدمی محویت کے عالم میں کھڑے ہیں۔ جاتی ہوئی موٹریں ٹھہر جاتی ہیں، اور اُس پر سے رؤسا اُتر اُتر کر گانا سننے لگتے ہیں۔ خوانچے والے رک جاتے ہیں۔ اور خوانچہ لئے بھجن سننے لگتے ہیں۔ اندرا اپنے پیارے شاعر ہری ہر کا ایک معرفت میں ڈوبا ہوا پد گا رہی ہے۔ اس کی مستانہ لے سب کو مست کر رہی ہے۔

(۵)

کئی سال ہوئے۔ ہری ہر ایک متموّل رئیس تھا۔ شعر و سخن کا دلدادہ، فلسفیانہ خیالات میں ڈوبا ہوا۔ تصوّف میں رنگا ہوا۔ اپنے عالیشان محل کو چھوڑ کر ایک جھونپڑی میں بیٹھا تصوّف اور فلسفہ کے جذبات کو شعر اور نغمہ کے دلفریب رنگ میں ادا کیا کرتا تھا۔ معرفت کی حقیقتیں اسکے دل و دماغ میں جا کر صفات شعری سے آراستہ ہو جاتی ہیں۔ ساری رات بیٹھے گذر گئی ہے اور وہ اپنے خیالات میں مست ہے۔ کھانے پینے، کپڑے لتّے کی فکر نہیں دُنیا اس کی نظروں میں خواب ہے۔ محض سرابِ آرزو۔ اِس کی کوئی چیز اس کے خیال میں ایسی نہیں۔ کہ انسان اِس میں دل لگائے۔ وہ اپنی ملکیت اور جائیداد کی پرواہ نہیں کرتا۔ کاروبار کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا۔ کاروباری

لوگ اس سے بار بار ملنے آتے ہیں۔ وہ اپنے گوشہ عافیت سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں اگر کوئی پھٹے حال فقیر آجاتا ہے۔ تو فوراً آکر اُسے مہمان خانہ میں لے جاتا ہے۔ غربا کے لئے اسکی ساری ثروت وقف ہے۔ کبھی غریبوں کو کمبل تقسیم کرتا ہے۔ کبھی غلہ۔ کوئی بھوکھا سائل اس کے دروازے سے مایوس نہیں جانے پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ قرضہ سے زیر بار ہو جاتا ہے۔ قرضخواہ نالشیں کرتے ہیں۔ اُس پر ڈگری ہوتی ہے۔ ہری ہر کبھی اپنا گوشہ تنہائی چھوڑ کر مقدمہ کی پیروی کرنے نہیں جاتا۔ اُس کی جائداد قرق ہورہی تھی۔ اور وہ اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ستار پر ایک پد گا رہا تھا۔ جو اُس نے ابھی ابھی تصنیف کیا تھا۔ سجاوٹ اور تکلف کی چیزیں اُس کے محل سے نکالی جاتی ہیں۔ اور نیلام کردیجاتی ہیں۔ اُسے مطلق غم نہیں۔ تب اُس کا محل نیلام ہوتا ہے۔ وہ اُسی طرح بے اثر رہتا ہے۔ اِس محل میں آکر ایک نوبڑھا رئیس قبضہ جما لیتا ہے۔ ہری ہر کے پاس اب بھی وسیع علاقہ ہے۔ وہ چاہے تو پھر شاندار محل بنوا سکتا ہے۔ مگر اُسے ملکیت سے محبّت نہیں۔ وہ ہر ایک گاؤں میں گھوم گھوم کر اپنے اسامیوں کو زمینداری کے حقوق عطا کر دیتا ہے یہاں تک کہ اُس کے ۱۰۱ مواضعات سب آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ جس گاؤں میں جا نکلتا ہے۔ لوگ اس کا استقبال کرنے دوڑتے ہیں۔ اور اُس کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگاتے ہیں۔ اِس کے لئے ہمہ نعمت حاضر کی جاتی ہے۔ لیکن وہ گاؤں کے باہر کسی درخت کے سایہ میں مقیم ہوتا ہے۔ اور جنگلی پھل کھاکر سو رہتا ہے۔ آخر ملکیت کی فکر سے آزاد ہو کر وہ اطمینان سے پھر اپنے گوشہ عافیت میں آبیٹھتا ہے۔ آج اِس خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اُس کی کٹی میں اب بھی کتنی ہی فالتو چیزیں ہیں۔ جنہیں اُس کی نفاست پسند طبیعت نے جمع

کر رکھا ہے۔ مُصوّری اور صنعت کے ان کمالات کو جمع کر کے ایک وہ ڈھیر
لگاتا ہے۔ اور اُس میں آگ لگا دیتا ہے۔ اُس کا ستار اور طنبورا اور دف،
وِرتیں، مرگ چھالے، تصوّف اور فلسفہ کی کتابیں سب اس ڈھیر میں جلکر
خاک ہو جاتی ہیں۔ وہ مُتبسّم کھڑا اِن چیزوں کو خاک ہوتے ہُوئے دیکھتا ہے

(۶)

شام ہو گئی ہے۔ شہر کے چوک میں اندرا اپنے طنبورے پر ایک پد گا
رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہے۔ بڑے بڑے رؤسا اور اُمرا محو
کھڑے ہیں۔ ہری ہر وہ نغمہ دِل نواز سُن کر چونک پڑتا ہے۔ کان لگا کر سُنتا
ہے، اور تب لپک کر مجمع کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اندرا اسی کا پد گا رہی
ہے۔ اُس کی ایک ایک تان اُسکے دل پر چوٹ کرتی ہے۔ ہری ہر کو آج
اپنی کلام کی گہرائی درد، اور تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ نقش حیرت بنا ہُوا کھڑا
رہتا ہے۔ یہاں تک کہ گانا ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ رُخصت ہو جاتے ہیں۔ اندرا
بھی وہاں سے چلی جاتی ہے۔ مگر ہری ہر ابھی تک وہیں مُورت کی طرح، خیال
میں ڈوبا ہُوا بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ جب بالکل سنّاٹا ہو جاتا ہے۔ تو
اُسے اپنے گرد و پیش کی خموشی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دو ایک آدمیوں سے
اندرا کا پتہ پوچھنا چاہتا ہے۔ مگر جھجک کے مارے نہیں پوچھتا۔ مجبور ہو کر
وہ اپنی کُٹی میں لوٹ جاتا ہے۔ اور پریم کا پہلا گیت لکھتا ہے۔ وہ ساری
رات ایک بیتابی کے عالم میں کاٹ دیتا ہے۔ اور دُوسرے دن شام کو
پھر چوک کی طرف جاتا ہے۔ آج بھی اندرا چوک میں گا رہی ہے۔ ہجوم کل
سے کئی گنا زیادہ ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی جنبش کر سکے۔ ہری ہر بھی

بُت بنا ہوا سُنتا ہے۔ اور جب آدھ گھنٹہ کے بعد اندرا چلی جاتی ہے تو وہ اُس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ عقیدتمندوں کا ایک اژدہام ساتھ ہے۔ مگر کُٹی کے قریب پہنچکر اندرا سب آدمیوں کو رخصت کر دیتی ہے۔ صرف ہری ہر اس کے کچھ فاصلے پر چلا آرہا ہے۔ اندرا اپنی کُٹی میں پہنچکر پانی بھر لاتی ہے۔ اور تب ٹھاکر جی کا بھوگ لگا کر خود کھاتی ہے۔ پھر زمین پر پڑ رہتی ہے۔

سفید چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ہری ہر کُٹی کے سامنے زمین پر بیٹھکر پھتر کے ٹکڑوں پر کوئلے سے تازہ عشق و محبت کا گیت لکھنے لگتا ہے۔ ساری رات لکھتے گذر جاتی ہے۔ جب مشرق کی طرف طلوعِ سحر کی سُرخی نمودار ہوتی ہے۔ تو وہ اُن سنگریزوں کو کُٹی کے دروازے پر ترتیب سے رکھ کر وہاں سے کچھ دُور ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ جاتا ہے۔ سنگریزے اس طرح رکھے گئے ہیں۔ کہ اندرا کو اُس کا پیغامِ محبت پڑھنے میں مطلق تردد نہ ہو۔

علی الصباح اندرا سندھیا پوجن اور کیرتن کے بعد جب باہر نکلتی ہے تو عین دروازہ پر اُسے چوکور سنگریزے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ حیرت میں آکر ایک پتھر اُٹھا لیتی ہے۔ اِس پر اُسے کوئی تحریر نظر آتی ہے۔ ارے! یہ تو کوئی پریم کا نغمہ ہے! وہ دُوسرا پتھر اُٹھاتی ہے۔ اُس پر بھی وہی تحریر ہے۔ وہ اس گیت کا دوسرا بند معلوم ہوتا ہے۔ پھر تو وہ سارے سنگریزوں کو اُٹھا اُٹھا کر پڑھتی ہے۔ اور انہیں ایک قطار میں رکھکر پُورا گیت پڑھ لیتی ہے۔ اس گیت میں وہ درد اور تاثیر ہے۔ کہ اندرا کا کلیجہ تھام کر رہ جاتی ہے۔ یہ اُسی زندۂ جاوید ہری ہر کا کلام ہے۔ کتنی ہی بار اندرا کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی۔ کہ اُس شاعر کے درشن کرے۔

لیکن اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے۔ آج یہ پیغام محبت پاکر وہ دیوانہ وار اُس کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ وہ کہیں قریب ہی ہوگا۔ اِس کا اُسے یقین ہے۔ وہ چاروں طرف اُسے تلاش کرتی ہے۔ اور آخر وہ اُسے کُٹی کے عقب میں زمین پر سوتا ہُوا نظر آتا ہے۔ وہ حیرت آمیز مُسرّت سے اُس کے چہرہ کی طرف دیکھتی ہے۔ مکھیاں اُسے ستا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ اپنے آنچل سے مکھیاں اُڑانے لگتی ہے۔ ہری ہر کی نیند کھُل جاتی ہے۔ اور اندرا کو آنچل سے پنکھا جھلتے دیکھ کر وہ اِس محبت کا مزہ لینے کے لئے پڑا رہتا ہے۔ تب وہ اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اندرا اُسے پرنام کرتی ہے۔

اب ہری ہر بھی وہیں رہتا ہے۔ وہ کُٹی کے اندر رہتی ہے۔ ہری ہر باہر۔ دونوں ساتھ پہاڑیوں کی سیریں کرتے، جنگلی پھُول پھل جمع کرتے۔ پہاڑیاں اندرا کے نغموں سے گونج جاتی ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ ٹھاکر جی کے بڑے مندر میں کیرتن کرنے جاتے ہیں۔ وہ اب شہر کے چوک میں اپنا راگ سُنانے نہیں آتی۔ اب اُس کا سننے والا صرف ہری ہر ہے۔ مگر شہر کے عقیدتمندوں کی اب بھی کُٹی کے سامنے بھیڑ لگ جاتی ہے۔ اور لوگ تحفے تحائف دے جاتے ہیں۔ جنہیں اندرا فیاضی سے غربا میں تقسیم کر دیتی ہے۔

(۷)

صُبح کا وقت، جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی اندرا گا رہی ہے۔ اور ہری ہر سامنے بیٹھا ہُوا ٹھاکر جی کے لئے ایک ہار گوندھ رہا ہے۔ جھیل میں مرغابیاں ہنس وغیرہ تیر رہے ہیں۔ کناروں پر ہرن، نیل گائے وغیرہ سب گویا اِس نغمہ سے مست ہو رہے ہیں۔

یکایک راجکمار گیان سنگھ گھوڑے پر سوار ادھر سے گذرتا ہے۔ اس کے ساتھ کئی برقنداز، شکاری اور مصاحب ہیں۔ نہایت شکیل مردانہ صورت کا نوجوان ہے۔ ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ اونچا قد، فراخ سینہ اونچی پیشانی۔ اندرا کا نغمہ سنتے ہی اسے جیسے سکتہ سا ہو جاتا ہے۔ اس کا گھوڑا وہیں رک جاتا ہے۔ اور سارا مجمع چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے اندرا معرفت کے نشہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسے گیان سنگھ کے آنے کی متعلق خبر نہیں ہوتی۔ جب گانا ختم ہو جاتا ہے۔ تو راجکمار گھوڑے سے اتر پڑتا ہے۔ اور اندرا کے پاس آکر ادب سے پرنام کرتا ہوا اس کا نام دریافت کرتا ہے۔ وہ اب تک بن بیاہا تھا۔ صدہا پیغامات راجوں مہاراجوں کے یہاں سے آئے۔ اس نے ایک بھی منظور نہ کیا۔ آج اس حسینہ کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے ادب کے ساتھ اپنے محل میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اندرا ایک دن کی مہلت مانگتی ہے۔ گیان سنگھ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے۔ لیکن شکار میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا۔ اسے یکایک شکار سے نفرت اور ہر ایک جاندار سے انس ہو جاتا ہے۔ اسے اب ہرنوں کا شکار کرتے صدمہ ہوتا ہے۔ وہی نغمہ درد سے اس کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اور آنکھوں میں وہی صورت بسی ہوئی،

(۸)

اندرا یہ دعوت پاکر خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اسے اس شعلہ کی متعلق خبر نہیں ہے۔ جو اس کے حسن اور نغمہ نے گیان سنگھ کے دل میں روشن کر دیا ہے۔ وہ سوچتی ہے۔ شاہی عنایات کی بدولت وہ زندگی

کی تفکرات سے آزاد ہو جائیگی۔ اور ہری ہر کے ساتھ گوشہ قناعت میں
بیٹھی ہوئی زندگی کے دن کاٹ دیگی۔ ہری ہر خیال کرتا ہے۔ کہ اندرا
رنواس میں کتنی خوش ہو گی۔ کیونکہ راجکمار کے دل کی کیفیت اس سے مخفی
نہیں رہتی۔ کیا ایسی بیمثال حسینہ کوہ و بیابان میں پھرنے کے قابل ہے۔ اسے
ایشور نے کسی رنواس کی زینت بننے کے لئے ہی بنایا ہے۔ ہری ہر کے
ساتھ رہ کر اُسے فقر اور فاقہ کے سوا اور کیا نصیب ہوگا۔ وہ اس دیوی کو
ان آزمائشوں میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اُس کی رُوحانی تسکین کے لئے اتنا
ہی یقین کافی ہے۔ کہ اندرا کے دل میں اُسکی جگہ ہے۔ یہی خیال اُس کی
زندگی کو معراجِ کمال تک پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ اُس کے دل میں اور
کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں ہے۔

رات گذر جاتی ہے۔ علی الصباح ہری ہر پھولوں کے زیوروں سے
اندرا کو آراستہ کرتا ہے۔ اُس دن اندرا کو عقیدتمندوں نے جتنے تحفے پیش
کئے ہیں۔ وہ سب ہری ہر نے جمع کر رکھے ہیں۔ وہ اندرا کے حسن کو ان آرائشوں
سے اور بھی چمکا دیتا ہے۔ مگر جب موقعہ مل جاتا ہے۔ تو اندرا کی آنکھیں بچاکر
آنسو کی دو چار بوندیں بھی گرا لیتا ہے۔ اندرا سے تو وہ ہنس ہنسکر باتیں کرتا ہے
گویا اُسے کوئی اندیشہ کوئی غم نہیں ہے۔ مگر دل میں اُسے یقین ہے۔ کہ اب پھر
اندرا کے درشن نہ ہونگے۔ یہ خوف بھی ہے۔ کہ اندرا کے دل میں اب اُس کی
یاد نہ رہیگی۔ شاہی عیش و عشرت میں پڑکر وہ اُسے یقیناً بھول جائیگی۔ کون کس
کو یاد کرتا ہے لیکن وہ اس خیال سے اپنے دل کو تسکین دیتا ہے۔ وہ تو آرام
سے رہیگی۔ رعایا کو تو اس کی ذات سے فیض پہونچیگا۔ کیا وہ اس قدر تبدیل
ہو جائیگی۔ کہ اختیار پاکر شاہی جور و ستم کے خلاف زبان نہ کھولے۔ کیا ڈھماتما کے

اُپدیش کو فراموش کر سکتی ہے۔

جب اندرا بن سنوار کر تیار ہو جاتی ہے۔ تو دونوں ساتھ بیٹھکر کیرتن کرتے ہیں۔ آج اِس کیرتن میں دونوں کے دِلوں میں مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اندرا بے خبری میں خوش ہے۔ اُسے اپنے روبرو بہار ہی بہار نظر آرہی ہے۔ وہ سنیاس اور ویراگ سے بیزار ہو چکی ہے۔ اور اب دُنیا کی نعمتوں کا لُطف اٹھانا چاہتی ہے۔ اس کے خیال میں شاہی عنایتیں اِس کے لیئے آسائش کا دروازہ کھول دینگی۔ وہ اِس وقت بھی اِس زندگی کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ ہری ہر کے لئے اچھے اچھے کھانے پکائیگی۔ اُس کے لئے اچھے اچھے کپڑے بنوائیگی۔ اس کے سر میں تیل ڈالیگی۔ جب وہ سوئیگا تو اُس کے لئے پنکھا جھلیگی۔ کیا ایسا باکمال، خدا رسیدہ شاعر اِس قابل ہے کہ دُنیا کی ناقدری کا شکار بنے! مگر ہری غمناک خیالات میں ڈوبا ہوا ہے۔ اُس کے سامنے تاریک مستقبل ہے۔

اُسی وقت گیان سنگھ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سواری لئے آ پہونچتا ہے۔

(۹)

شاہی محل آراستہ اور پر تکلف کمرے۔ حسین کنیزیں۔ راج ماتا کا دربار لگا ہوا ہے۔ اندرا محل میں پہونچ کر راج ماتا کو پرنام کرتی ہے۔ رانی اُس کی بڑی خاطر و مدارات کرتی ہیں۔ وہ اسنان کئے ہوئے پوجا کے لئے تیار بیٹھی ہوئی ہیں۔ اندرا اُن کے ساتھ مندر میں جاتی ہے۔ جو شیشہ د آلات سے سجا ہوا ہے۔ اور وہاں اُس کا کیرتن ہوتا ہے۔ اور بھی کئی شریف زادیاں

رانی کے ساتھ ہیں۔ سب اندرا کا کیرتن سُن کر بے خود ہو جاتی ہیں۔ رانی صاحبہ اندرا کو گلے لگا لیتی ہیں۔ اور اپنی موتیوں کی مالا نکال کر اُس کی گردن میں ڈال دیتی ہے۔ اندرا دُوسرا بھجن گاتی ہے۔ رانی اس کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہیں۔ بھگوان سے ایسی بھگتی کبھی اُس کے دل میں نہ اُمڈی تھی۔ اسی وقت پدما آتی ہے۔ پدما حُسن میں اندرا سے بالکل جُدا ہے۔ اُس کے حسن میں رُعب اور تمکنت، ملاحت اور کشش ہے۔ اندرا کے حُسن میں نزاکت اور انکسار، ایک چنبیلی کا پھُول ہے، سادہ اور نازک۔ اُس کا حُسن اُس کی نزاکت اور سادگی میں ہے۔ دُوسرا سُورج مُکھی ہے۔ خوش رنگ اور نظر فریب۔ پدما کا باپ سردار کیسری سنگھ راج میں وزارت کے عہدے پر مامور ہے وہ پدما کی شادی راجکمار گیان سنگھ سے کرنا چاہتا ہے۔ پدما بھی راجکمار کو سچے دل سے چاہتی ہے۔ مگر راجکمار اُس کی طرف زیادہ مائل نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اُس کی بہت خاطر اور دلجوئی کرتا ہے۔

پدما آکر راجکمار کو اندرا کی طرف گرویدہ نظروں سے تکتے دیکھتی ہے یہ بھی دیکھتی ہے۔ کہ یہاں اس کی کتنی قدر و منزلت ہو رہی ہے۔ خود اس کی اتنی قدر کبھی نہ ہوئی تھی۔ .... یہ معمولی بازاروں میں گانے والی عورت اُس سے بازی لے جائے اس خیال سے وہ دل میں جل جاتی ہے۔ اندرا سے اُسے فوراً حسد اور رقابت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اُسے ذلیل کرنے کے منصوبے باندھنے لگتی ہے۔ وہ رانی صاحبہ کو اس سے بدگمان کرنا چاہتی ہے۔ اس کی شکل اور صورت، وضع و قطع کا مذاق اڑاتی ہے۔ مگر جب اس کی بداندیشی کا اندرا پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو وہ اُسے بدنام کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنا بیش قیمت کنگن موقع پا کر اندر

کے طنبورے کے نیچے چھپا دیتی ہے۔ اور ذرا دیر بعد آ کے تلاش کرنے لگتی ہے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈھتی ہوئی وہ اندرا کے پاس آتی ہے۔ اور طنبورے سے کنگن نکال لیتی ہے۔ اندرا شرمندہ ہو کر رونے لگتی ہے۔ کنیزیں پدما سے بہت خوش رہتی ہیں۔ کیونکہ پدما انہیں انعام دیتی رہتی ہے۔ وہ سب اندرا سے بدگمانی ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن اس وقت گیان سنگھ آ جاتا ہے۔ اور اس واقعہ کی خبر پا کر اندرا کے بجائے پدما کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ اُسے اس معاملہ میں فتنہ انگیزی اور شرارت نظر آتی ہے۔ اندرا کی طرف سے وہ کسی قسم کی بدنیتی کا خیال ہی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کا رُخ دیکھ کر کنیزیں بھی اُسی کے ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اور رانی صاحب پدما کو سخت سُست کہتی ہیں۔ پدما دانت پیس کر رہ جاتی ہے۔

اُدھر ہری ہر شاہی محل کی دیوار کے نیچے خود فراموشی کی حالت میں کھڑا ہے۔ کہ شاید اندرا کی آواز کانوں میں پڑ جائے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ پھر اندرا کی کُٹی میں جاتا ہے۔ اور اس کی ایک ایک چیز کو لے کر چُومتا ہے۔ اور روتا ہے۔

دُوسرے دن محل میں پھر محفل آراستہ ہوتی ہے۔ آج مہاراجہ صاحب جردل بھی رونق افروز ہیں۔ اتفاق سے مانگلی کے کنور صاحب بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اُن چودہ پندرہ برسوں میں اُنہوں نے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے ہیں۔ اُن کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ بیوی اور بیٹی کی یاد میں بہت لاغر ہو گئے ہیں۔ مگر آرائش کا شوق ابھی تک قایم ہے اب بھی وہی سج پوری صافہ ہے۔ وہی نیچی اچکن، وہی امرتسری جوتا۔ اسی طرح بال سنوارے۔ حالانکہ ان ظاہری آرائشوں کے نیچے روتا ہوا دل

ہے۔ اِندرا جس وقت محو ہو کر گاتی ہے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں اندرا کی صورت میں اپنی جنت نصیب بیوی کا عکس نظر آتا ہے۔ پہلی بار جب انہوں نے اندرا کی ماں کو نویلی دولہن کے روپ میں دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ ہو بہو ایسی ہی تھی۔ اتنی مشابہت آج تک اُنہوں نے کسی عورت میں نہیں دیکھی۔ جب اندرا یہاں سے جانے لگتی ہے۔ تو وہ کئی قدم اُسکے ساتھ جاتے ہیں۔ اور موقعہ پاکر اس کا نام اور والدین کا حال پوچھتے ہیں۔ اندرا اپنے بچپن کا واقعہ اُن سے بیان کرتی ہے۔ راجہ صاحب کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اندرا میری ہی کھوئی ہوئی بیٹی ہے اُن کے دل میں بے اختیار ولولہ اُٹھتا ہے۔ کہ اسے گلے سے لگالیں۔ مگر شرم مانع ہوتا ہے۔ کیا خبر ہے۔ یہ کس کس کے ساتھ رہی، اُس پر کیا گیا گذری۔ یہ اُسے اپنی لڑکی کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ اندرا بھی اُن کے چہرہ کو غور سے دیکھتی ہے۔ اور اُسے کچھ کچھ یاد آتی ہے۔ کہ اس کے باپ کی شکل ان سے ملتی تھی۔ لیکن وہ بھی شرم سے اِس کا اظہار نہیں کرتی۔ کہ کہیں کنور صاحب انکار کریں۔ تو خفت ہو۔

راجہ صاحب جو دل اندرا کے کیرتن سے لتنے خوش ہوتے ہیں کہ اُسے پانچ موضع معافی عطا کر دیتے ہیں۔ اندرا اُن کے قدموں پر گر کر احسان مندی کا اظہار کرتی ہے۔

(۱۰)

راجکمار اپنی کشتی آراستہ کرتا ہے۔ اور اندرا کو سیر دریا کے لئے لے جاتا ہے۔ اندرا اس موقع کی منتظر ہے۔ کہ راجکمار سے ہری ہر کی

سفارش کرکے اُسے درباری شاعر کا رُتبہ دلادے۔ اِس لئے باوجود یکہ اُس کا دل یہاں سے جانے کے لئے بیتاب ہے۔ اور ہری ہر کی جدائی اُسے شاق گذر رہی ہے۔ مگر وہ جانے کا نام نہیں لیتی۔ سیر دریا میں شاید وہ موقع ہاتھ آ جائے۔ اِس لئے وہ اِس تجویز کو خوشی سے منظور کر لیتی ہے۔ کشتی لہروں پر خوش فعلیاں کر رہی ہے۔ اندرا ہری ہر کا ایک پد گانے لگتی ہے۔ دفعتاً اسے کنارے پر ہری ہر کھڑا نظر آ جاتا ہے۔ اُس کی صورت سے ایسی مایوسی برس رہی ہے۔ گویا یہ دائمی مفارقت ہے۔

راجکمار کا دل اِس پریم کے پد سے مدہوش ہو جاتا ہے۔ اُسے اب صبر کی تاب نہیں رہتی۔ وہ اندرا کے روبرو اپنے دلِ بیتاب کی داستان سناتا ہے اور اپنا دل اُسکی نذر کرتا ہے۔ اندرا کو اب معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک سنہرے جال میں پھنس گئی ہے۔ اب ہری ہر کا نام بھی زبان پر لانا قہر ہو جائیگا۔ راجکمار فوراً ہری ہر کے خون کا پیاسا ہو جائیگا۔ وہ دل میں افسوس کرتی ہے۔ کہ ناحق راجکمار کی دعوت قبول کی۔ یہ ہوس کا پہلا تازیانہ ہے۔ جو اُس پر پڑا ہے۔ وہ اب یہ بھی سمجھنے لگی ہے۔ کہ گو راجکمار اسکے روبرو سائل کی حالت میں کھڑا ہے۔ مگر فی الواقع وہ اُس کی قید میں ہے۔

وہ کہتی ہے۔ راج کمار! میں غریب عورت ہوں۔ اِس قابل نہیں۔ کہ تمہاری رانی بنوں۔ کہ تم بدنام ہو جاؤ گے اور عجب نہیں۔ کہ راجہ صاحب اور تمہاری ماتاجی بھی تم سے ناراض ہو جائیں۔ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ میں تمہیں مصیبتوں میں نہیں مبتلا کرنا چاہتی۔

راجکمار۔ میں تمہارے لئے تخت و تاج پر لات مار دونگا۔ اندرا مجھے کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پرواہ نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے

کو حاضر ہوں۔

اندرا - بہانہ کرتی ہے۔ کہ اُس نے سنیاس برت دھارن کر لیا ہے۔ اور اگر اُس عہد کی خلاف ورزی کی۔ تو اُن مہاتما جی کو کتنی تکلیف ہو گی جنہیں وہ اپنا گرو سمجھتی ہے۔ سورگ میں بھی اُنہیں اُس کی یہ حرکت دل شکستہ کر دیگی۔ وہ راجکمار کی عزت کرتی ہے۔ لیکن محبت کرنا اُس کے لئے ممنوع ہے اور وہ اپنے عہد کو نہیں توڑ سکتی۔

راجکمار - نہیں میرے اوپر مطلق رحم نہیں آتا اندرا؟

اندرا - میں اپنے عہد کو توڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔

راجکمار - یہ سب حیلے ہیں اِندرا - کیا میں خیال کروں۔ کہ تمہارے دل میں کسی دُوسرے کے لئے جگہ ہے؟

اندرا - میں نے آپ سے کہدیا میں سنیاسی ہوں۔

راجکمار - یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟

اندرا - ہاں - آخری۔

راجکمار - مایوسی کے عالم میں کمر سے تلوار نکال کر اپنے سینہ میں چبھونا چاہتا ہے۔ اندرا تیزی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔

راجکمار :- مجھے مرجانے دو اِندرا - جب میں تمہیں اِس زندگی میں نہیں پا سکتا - تو زندگی بیکار ہے۔

اندرا - اُس کی کمر میں تلوار لگاتی ہوئی دلجوئی کے لئے کہتی ہے میری جیسی ہزاروں عورتیں آپ کو ملینگی - ایک غریب تپسونی کا پریم آپ کو مل ہی جائے - تو آپ کو اُس سے تشفی نہ ہو گی۔

راجکمار کا چہرہ مسرت سے کھل جاتا ہے۔ کہتا ہے - محبت تو عہد اور

برت کی پرواہ نہیں کرتی۔ اندرا۔ اندرا۔ لیکن محبت چھو منتر سے پیدا ہونے والی چیز بھی تو نہیں۔ جو محبت ایک نگاہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ ایک نگاہ میں فنا بھی ہو سکتی ہے۔ تم راجکمار ہو۔ مجھے کیا بھروسہ ہے۔ کہ مجھ سے زیادہ حسینہ اور جمیلہ عورت پاکر تم میری طرف سے آنکھیں نہ پھیر لوگے پھر تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ وصال صنم کے لئے خدا کو چھوڑ کر اگر نامراد رہوں تو کیا ہو۔

راجکمار۔ ہاں یہ تمہاری شرط مجھے منظور ہے۔ اندرا نے مجھے موقعہ دو کہ میں اپنی محبت کا نقش تمہارے دل پر جما سکوں۔ لیکن اگر تم مجھ سے منہ موڑ کر چلی گئیں۔ تو دیکھ لینا اسی دن میں میرے مرنے کی خبر ملیگی۔

اندرا دیکھتی ہے۔ کہ ہری ہر آہستہ آہستہ دریا کے کنارے سے بستی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اپنی بیکسی اور مایوسی کا خیال کر کے اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔

(۱۱)

پدما آسانی سے اپنی آرزوؤں کا خون نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اندرا کے متعلق تحقیقات شروع کرتی ہے۔ کہ شاید کوئی ایسا پہلو ہاتھ آ جائے۔ جسکی بنا پر وہ اسے راجکمار کی نظروں سے گرا دے۔ ایک دن وہ اسکے قیامگاہ کا پتہ دریافت کرتی ہوئی اس کی کٹی تک جا پہونچتی ہے۔ وہاں ہری ہر سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ باتوں باتوں میں اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پیمان وفا میں بندھے ہوئے ہیں وہ اندرا کی بیوفائیوں کی داستان ہری ہر سے بیان کرتی ہے۔ اس نے

کئی تصویریں اُتروالی ہیں۔ جن میں اندرا کا راجکمار کے ساتھ سیر کرنا گانا بجانا، لکھنا پڑھنا نظر آتا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ اندرا وہاں ایسی خوش ہے گویا اسے کائنات کی دولت مل گئی ہو۔ اور تم اُس کے فراق میں گھُل رہے ہو۔ ایسی بیوفا عورت اسی قابل ہے۔ کہ اُس کی قلعی کھول دیجاوے۔ تاکہ وہ کہیں اپنا روسئے سیاہ نہ دکھا سکے۔ لیکن ان بدگوئیوں کا ہری ہر پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ آخر ادھر سے مایوس ہوکر پدما ایک دُوسرا جال پھیلاتی ہے۔ وہ ہری ہر کو اپنے ساتھ دربار میں لاتی ہے۔ اور راجکمار سے اُس کا تعارف کراتی ہے۔ راجکمار اُس کا کلام سُن کر بہت محظوظ ہوتا ہے۔ یہ وہی کلام ہے۔ جو اُس نے اندرا کے مُنہ سے سُنا ہے۔ راجکمار اِس کی بڑی خاطر کرتا ہے۔ پدما ہری ہر کی زبان سے ایسے الفاظ نکلوانا چاہتی ہے۔ جو اس کی محبت کا پردہ فاش کردیں راجکمار کو معلوم ہو جائے۔ کہ یہ اندرا کا عاشق ہے۔ لیکن ہری ہر اتنا محتاط ہے کہ وہ ایک لفظ بھی ایسا مُنہ سے نہیں نکلنے دیتا۔ جس سے محبت کا اظہار ہو۔ راجکمار اندرا کی تعریف کرتا ہے۔ ہری ہر اِس طرح سنتا ہے۔ گویا اندرا کا اُس نے نام بھی نہیں سُنا۔ پدما اسی وقت رنواس میں جاکر اندرا کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اُسے یقین ہے۔ کہ دونوں بروقت ملاقات ضرور ایسے خوش ہو جائینگے کہ اُس ضعیف بنیاد پر کوئی تعمیر کھڑی کی جاسکے۔ لیکن اندرا ہری ہر کو دیکھ کر بیگانہ وار پیش آتی ہے۔ اور ہری ہر بھی اُس سے زیادہ مخاطب نہیں ہوتا۔ تب پدما ایک مشاعرہ منعقد کرتی ہے۔ اور اِس میں ریاست کے بڑے بڑے خوشگوار شعرا کو مدعو کرتی ہے۔ یہ تجویز کی جاتی ہے۔ کہ جس کا کلام بہترین ہو اُسے درباری شاعر کا منصب عطاء کیا جائے۔ پدما کو یقین ہے۔ کہ ہری ہر کا کلام گوئے سبقت لے جائیگا۔ اِس لئے وہ اندرا کو منصف قرار دیتی ہے۔ راجکمار

راجکمار بھی بڑی خوشی سے اندرا کا منصف بنایا جانا منظور کرتا ہے۔ اندرا کو اب صاف نظر آرہا ہے۔ کہ اُس کی تباہی کے سامان کیئے جارہے ہیں۔ ہری ہر کا کلام یقیناً بہترین ہوگا۔ اور اُسے مجبوراً اُسی کو فائق کہنا پڑیگا۔ ہری ہر کی حمائیت یا سفارش میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالنا اُس کے لئے زہر قاتل کا کام دیسکتا ہے۔ اُس کے فیصلہ پر اعتراض کرنا اور ہری ہر کے کلام میں نقائص نکال کر راجکمار کو اندرا سے بدظن کردینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ چاہتی ہے۔ کہ اگر موقع ملے۔ تو ہری ہر کو آگاہ کردے۔ مگر یہ موقع اُسے نہیں ملتا۔ پدما مشاعرہ کی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے۔ مقررہ تاریخ کو سبھی مقرر تشریف لاتے ہیں ہری ہر بھی آتا ہے۔ شرط تازہ کلام کی ہے۔ ہری ہر نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی اور شعرا اپنے کلام سناتے ہیں۔ چاروں طرف نعرہ تحسین بلند ہوجاتا ہے۔ بالآخر جب ہری ہر کی باری آتی ہے۔ تو وہ صاف کہدیتا ہے۔ میں نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی۔ اُس نے بھی پدما کی ان سرگرمیوں کو اپنی فراست سے تاڑ لیا ہے اور اُس کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اندرا اُسے تائید غیبی سمجھ کر پرماتما کا دل میں شکریہ ادا کرتی ہے۔ انعام اور منصب ایک دوسرے شاعر کو مل جاتے ہیں۔ اور اندرا کی محبت کا راز سربستہ رہ جاتا ہے۔ ہری ہر یہاں سے بہت خوش خوش رخصت ہوتا ہے۔ اندرا رنواس میں خوش و خرم ہے۔ اس سے زیادہ مسرت کی بات اس کے لئے اور کیا ہوسکتی ہے۔

(۱۲)

راجکمار گیان سنگھ کی گدی نشینی کا جشن۔ شہر چراغاں ہورہا ہے۔ چورستوں پر عالیشان پھاٹک بنائے گئے ہیں۔ جن پر نوبت بج رہی ہے

شاہی محلات اور دفاتر خوب آراستہ کئے گئے ہیں۔ صدر پھاٹک سے چوک تک دو رویہ بجلی کے خوشرنگ بلب لگائے گئے ہیں۔ کنارے کے درختوں پر بجلی کی روشنی کے حروف میں دعائیہ کلمات نکالے گئے ہیں۔ پنڈت لوگ مہورت دیکھتے ہیں۔ اسی وقت گیان سنگھ محل سے نکل کر عالی شان منڈپ میں آتا ہے۔ جو اسی تقریب کے لئے نصب کیا گیا ہے۔ ارکین دربار اور رؤسا نذرانے پیش کرتے ہیں۔ گیان سنگھ اُٹھ کر اپنے طرزِ عمل کا اعلان اور ملازمان شاہی و نیز رعایا کو اپنے فرائض کی پابندی کی ہدائیت کرتا ہے۔ اسامیوں کا نصف لگان اُس نے معاف کر دیا ہے۔ اِس لئے رعایا بیحد خوش ہے۔ سب اظہار مسرت کرکے اُس کو دعائیں دیتے ہُوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پھر غربا کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ قیدیوں کی رہائی کا حکم ہوتا ہے۔ تب فوجوں کی سلامی اور قواعد ہوتی ہے۔ بینڈ بجتا ہے۔ افسروں کو تمغے اور پروانے ملتے ہیں۔ پھر آتش بازیاں چھوڑی جاتی ہیں۔ اسکے بعد ٹھاکر دوارے میں کیرتن ہوتا ہے۔ ہری ہردہاں اندرا کے درشنوں کے اشتیاق میں آیا ہے۔ مگر کیرتن کرنے والوں میں اندرا نہیں ہے۔ طوائفوں کو مطلق مدعو نہیں کیا گیا۔ جیسا عام دستور تھا۔ گیان سنگھ نے اِس تقریب میں بھی بیجا صرف نامنظور کر دیا ہے۔ شہر میں خبر گرم ہے کہ اندرا کی شادی گیان سنگھ سے ہوگی۔ ایسی مہربان، غریب پرور، ہردل عزیز رانی پانے سے ہر خاص و عام خوش ہے۔

کیرتن کے بعد گیان سنگھ اندرا کے پاس جاتا ہے۔ اور کہتا ہے

اندرا کیا ابھی تمہارا امتحان پورا نہیں ہُوا۔

اِندرا کہتی ہے۔ ابھی نہیں۔ مجھے اِس رُتبہ کے قابل بننے دیجئے راجکمار۔ اِس تقریب کی یادگار میں...... محبت کا کوئی تحفہ پیش

کرتا ہوں۔
اندرا۔ محبت کا کوئی تحفہ ابھی میرے لئے منع ہے۔
راجکمار:۔ تم بڑی بیرحم ہو اندرا،،
اندرا:۔ اور ایسے بیرحم آدمی کو آپ رانی بنانا چاہتے ہیں۔ رانی کو رحم دل ہونا چاہئے۔
راجکمار۔ ساری دنیا کے لئے تو تم رحم کی دیوی ہو۔ میرے لئے پتھر کی مورت،

گیان سنگھ اب اندرا کے ہاتھوں میں ہے۔ رُوح وہ ہے۔ جسم گیان سنگھ ہے۔ اندرا کو رعایا کے حقوق کا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولتا۔ آئے دن نئے نئے فرمان جاری ہوتے رہتے ہیں۔ جنمیں رعایا کو کوئی نہ کوئی نیا حق عطا کیا جاتا ہے۔ شاہی اخراجات کم کئے جاتے ہیں۔ شاہی محل میں بھی وہ نفاست اور شوکت نہیں ہے۔ خادموں کی ایک پُوری فوج تھی۔ اُنہیں جواب دیدیا جاتا ہے۔ حسین لونڈیوں کا بھی ایک قافلہ تھا۔ اُنہیں بھی جواب مل جاتا ہے۔ محلات کے کئے حصّے رعایا کی ضرورتوں کے لئے علیحدہ کردئے جاتے ہیں۔ ایک محل میں کتب خانہ کھل جاتا ہے، دُوسرے میں شفا خانہ۔ ایک پُوری عمارت کسانوں اور مزدوروں کے لئے وقف کردیجاتی ہے۔ جہاں اُن کی پنچائتیں ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کے زرعی آلات کی نمائش کی جاتی ہے۔ فوج کے بڑے حصّے کو موقوف کردیا جاتا ہے۔ اُس کی جگہ رعایا میں سے نوجوان چُن لئے جاتے ہیں۔ اور قومی فوج آراستہ کی جاتی ہے۔ نوجوانوں کے لئے ورزش گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ گیان سنگھ ملوکیت کی آب و ہوا میں پلا ہُوا شہزادہ ہے۔ اُس کا حکم رعایا کے لئے قانون ہو سکتا تھا۔ اب وہ قدم قدم پر اپنے اوپر بندشیں عاید کرتا ہے۔ یہ سب اندرا کی تحریک کا اثر ہے۔ اندرا جو فرمان لکھتی ہے۔ اُس پر وہ آنکھیں بند کر کے

دستخط کر دیتا ہے۔

اِدھر اُمرا اور ارکین دربار کے حلقہ میں بڑی تشویش پھیلتی ہے۔ اُن کے خیال میں ریاست تباہ ہوئی جاتی ہے۔ گیان سنگھ کی یہی حالت رہی۔ تو تھوڑے دنوں میں اُمرا کا خاتمہ ہو جائیگا۔ حریت کے اِس سیلاب کو روکنے کی سازشیں کیجاتی ہیں۔ پدما اِس سازش کی رُوح رواں ہے۔ یہ لوگ تخفیف شدہ فوج کے سپاہیوں اور برخاست شدہ شاہی ملازموں میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں اُمرا میں بھی شورش پیدا کرتے ہیں۔ گیان سنگھ کو بزور شمشیر زیر کرکے کسی دُوسرے راجہ کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ پدما کا اس سازش سے صرف یہی منشا ہے۔ کہ اِندرا ذلیل اور بدنام ہو۔ وہ اُسی کو بدنام کرتی ہے۔ اور ان ساری تغیرات کا واحد سبب اِندرا ہی کو ٹھہراتی ہے۔ اِس لئے باغیوں کی یہ جماعت اس کی جان کی دُشمن ہو جاتی ہے۔ مسلح شورش کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔

گیان سنگھ اور اِندرا شاہی محل کے ایک مختصر سے کمرہ میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ کمرہ میں کوئی تکلف یا آرائش نہیں ہے۔ اِندرا نے آج یہ بازی لگائی ہے۔ کہ اگر وہ جیت جائیگی۔ تو راجہ سے جو چیز چاہیگی طلب کریگی۔ راجہ کو اس کی تعمیل میں انکار نہ ہوگا۔ راجہ ہی کو یہی اختیار ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے خیال میں خوش ہیں۔ گیان سنگھ کی خوشی کا وار اپار نہیں ہے۔ وہ آج اپنی کامیابی کے یقین سے پھولا نہیں سماتا۔ دونوں خوب دل لگا کر کھیل رہے ہیں۔ پہلے راجہ صاحب غالب آتے ہیں۔ اور اندرا کے کئی مہرے پِٹ لیتے ہیں۔ اُن کی مسرت ہر لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔ دفعتاً بازی پلٹ جاتی ہے۔ راجہ کے بادشاہ پر شہ پڑ جاتی ہے۔ اور اُس کا فرزین پِٹ جاتا ہے۔ پھر تو ایک ایک کرکے اس کے سبھی مُہرے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ہار جاتا

ہے۔ اِس کے چہرہ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ اِندرا اسی وقت ایک فرمان نکالتی ہے۔ اور راجہ سے اس پر دستخط کرنے کی التجا کرتی ہے۔ راجہ دبی ہوئی نظروں سے فرمان کو دیکھتا ہے۔ غلہ کا محصول درآمد معاف کر دیا گیا ہے جس سے شاہی محاصل میں ایک معتد بہ رقم کی کمی ہو جاتی ہے۔ ریاست میں غلہ بہت کم ہوتا ہے۔ غلہ زیادہ تر دیگر ملکوں سے آتا ہے۔ اس پر درآمد محصول کے باعث غلہ گراں ہو جاتا تھا۔ اور رعایا کو تکلیف ہوتی تھی۔ اِندرا غربا کو ارزاں غلہ بہم پہنچانے کی فکر میں تھی۔ اور آج موقعہ پا کر اُس نے یہ فرمان پیش کیا۔ گیان سنگھ کو تامل تو ہوتا ہے۔ مگر زبان ہار چکا ہے۔ فرمان پر دستخط کر دیتا ہے۔

اُس وقت باہر ایک شور برپا ہوتا ہے۔ ایک سنتری دوڑا ہوا آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے۔ باغیوں نے شاہی محل کو گھیر لیا ہے۔ اور اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۱۳)

گیان سنگھ کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہو جاتا ہے۔ وہ فوراً اسلحہ سے آراستہ ہو کر اندرا سے رخصت ہوتا ہے۔ اور فصیل کے اوپر چڑھ کر بلند آواز میں شورش کرنیوالوں کو مخاطب کر کے اس شورش کا سبب پوچھتا ہے۔

ایک آدمی نیچے سے جواب دیتا ہے۔ ہم یہ مظالم نہیں برداشت کر سکتے۔ اِندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔ وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی۔

گیان سنگھ اِندرا کے احسانات جو اُس نے قوم پر کئے ہیں۔ بیان کرتا ہے۔ مگر نیچے سے وہی جواب آتا ہے۔ اِندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔

وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی۔ گویا کوئی گراموفون کی صدا ہو۔

گیان سنگھ تب وہ فرمان نکال کر پڑھنا شروع کرتا ہے۔ جس پر اُس نے ابھی دستخط کیا ہے۔ مگر اس کا بھی باغیوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پھر وہی رٹ لگائی جاتی ہے۔ اندرا ہماری رانی نہیں بن سکتی۔ وہی ہماری تباہی کا باعث ہے، اس کے ساتھ ہی باغی لوگ زینوں سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں صدر دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

گیان سنگھ :۔ اب غضبناک ہو کر دھمکیاں دیتا ہے۔ مگر اس کی فہمائش کی طرح دھمکیاں بھی مجمع پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ وہ برابر فصیل پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

گیان سنگھ طیش میں آکر خطرے کے گھنٹے کے پاس جاتا ہے۔ اور اُسے زور سے بجاتا ہے۔ فوج کے سپاہی سُنتے ہیں۔ مگر نکلتے نہیں۔ دوسری بار گھنٹہ بجتا ہے۔ سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ اور جلدی جلدی اسلح جمع کرنے لگتے ہیں۔ تیسرا گھنٹہ ہوتا ہے۔ سب فوج نکل پڑتی ہے۔ اُسی وقت پدما آکر انہیں بہکاتی ہے۔ نادانو! کیوں اپنے پانوں میں کلہاڑی مارتے ہو۔ کیا اب تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں۔ تمہارے کتنے ہی بھائی علیحدہ کر دئے گئے۔ اور آج دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ تم لوگوں کی باری بھی بہت جلد آئی جاتی ہے۔ اور یہی لیل و نہار ہیں تو دو چار مہینے میں سب کے سب نکال دئے جاؤگے۔ یہ باغی کون ہیں۔ یہ وہی تمہارے بھائی ہیں۔ جنہیں گیان سنگھ کی نئی بن بیاہی رانی اندرا نے نکال دیا ہے۔ ایک بازاری طوائف ہمارے اوپر اس طرح حکومت کر رہی ہے۔ کیا تم لوگ اسے برداشت کر سکتے ہو۔ اس تقریر کا یہ اثر ہوتا ہے۔ کہ سپاہی واپس جاتے ہیں۔ اور اپنے

اسلئے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

اِس وقت پدما اندرا کے پاس آکر دوستانہ مشورہ دیتی ہے۔ اندرا جاگ جاؤ۔ ورنہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ اندرا اِس موقعہ کو غنیمت سمجھتی ہے۔ اور پدما کا احسان مانتی ہے۔ پدما اُسے ایک چور دروازہ سے لے جاتی ہے۔ جو شہر کے باہر ایک مندر میں کھلتا ہے۔ ایسے ہی نازک موقعوں کے لئے وہ سرنگ بنائی گئی ہے۔ پدما نے ہری ہر کو وہاں پہلے ہی بلا لیا ہے۔ اُسکے ساتھ دو گھوڑے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ ہری ہر ایک گھوڑے پر اندرا کو سوار کراتا ہے۔ دوسرے پر خود بیٹھتا ہے۔ اور دونوں شہر کی اندھیری سڑکوں پر ہوتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

اُسی وقت پدما فصیل پر آکر گیان سنگھ کی بغل میں کھڑی ہو کر کہتی ہے بہادرو! میں تمہیں مژدہ سناتی ہوں۔ کہ اندرا اب اس محل میں نہیں ہے تم میں سے کوئی ایک معتبر آدمی قصر شاہی میں آکر اپنا اطمینان کر سکتا ہے وہ جس گمنامی سے نکلتی تھی۔ اُسی میں پھر چلی گئی ہے۔ اب تم لوگ واپس جاؤ۔ میں تم لوگوں کو اطمینان دلاتی ہوں۔ کہ تم لوگوں کے سر سے یہ احکامات ہٹا لئے جاوینگے۔

گیان سنگھ زخم خوردہ طائر کی طرح ایک ٹھنڈی سانس لے کر گر پڑتا ہے۔ باغیوں کی جماعت لوٹ جاتی ہے۔ اور گیان سنگھ کو اس شورش سے نجات دلانے کی نیکنامی پدما کو ملتی ہے۔

گیان سنگھ مایوسانہ لہجہ میں پوچھتا ہے۔ اندرا کہاں چلی گئی؟

پدما۔ جہاں سے آئی تھی وہیں چلی گئی۔ اگر تم سمجھتے ہو۔ کہ اُسے تم سے محبت تھی۔ تو تم غلطی پر ہو۔ وہ یہاں بدرجہ مجبوری پڑی ہوئی تھی۔ اُس

کا عاشق وہی بدنصیب شاعر ہری ہر ہے۔ اسی پردہ جان دیتی ہے۔ اُس کو کوئی منصب دلانے کی فکر میں وہ یہاں پڑی ہوئی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ یہاں خطرہ ہے۔ تو بھاگ نکلی۔ بیوفا تھی۔

گیان سنگھ نیم جانی کی حالت میں اندر آتا۔ اور اُسی غیظ میں اندرا کی ایک ایک چیز کو پیروں سے کچل ڈالتا ہے۔ عشق ناکام ہوکر حسد کی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ اندرا کی کئی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی ہیں۔ گیان سنگھ ان تصاویر کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ پدما اِس وقت تحمّل اور عفو کی دیوی بنی ہُوئی ظاہر میں اُس کے غُصّہ کو فرو کر رہی ہے۔ مگر باتیں ایسی ایسی چوٹ کرنے والی کہتی ہے۔ کہ گیان سنگھ کی آتش حسد اور بھی مشتعل ہو جاتی ہے۔ وہ اُس کے طنبورے کے سینکڑوں ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ دفعتاً اسے ایک بات یاد آ جاتی ہے۔ وہ فوراً باہر آتا ہے۔ اور کئی معتبر سپاہیوں کو اندرا کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ کر دیتا ہے۔ اور حکم دیتا ہے کہ شہر کے سب ناکے بند کر دئے جائیں۔

پھر اندر جا کر اندرا کی پُوجا کی چیزیں، ٹھاکر جی کا سنگھاسن سب اُٹھا اُٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ جو کنیزیں اندرا کی خدمت پر مامور تھیں انہیں نکال دیتا ہے اور ایک جنوں کے عالم میں پیر ٹپکتا ہُوا بار بار اندرا کو کوستا ہے۔ مکارہ، عیارہ، ساحرہ، بیوفا، دغاشعار،

پدما ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر اُسے دیتی ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں اُسے خالی کر کے گلاس کو پٹک دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ پدما اُسے پنکھا جھلنے لگتی ہے۔ اِن دلجوئیوں سے راجہ کا دل پدما کی طرف سے نرم پڑ جاتا ہے۔ وہ اُسے ضبط اور

وفا کی دیوی خیال کرنے لگتا ہے۔ احسان مندی کا احساس بھی کچھ کم نہیں ہے۔
پدما اگر آڑی نہ آتی۔ تو باغیوں نے محل پر قبضہ کر لیا ہوتا اور معلوم نہیں۔ اس کے سر
پر کیا آفت ہوتی۔ وہ اُس سے اپنی گذشتہ فروگذاشتوں کی معافی مانگتا ہے۔ اور
پہلی بار اُس کی محبت کا جلوہ اُس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس مایوسی اور
غم کی حالت میں پدما ہی اُسے اپنی نجات کی دیوی نظر آتی ہے۔ وہ اُسے
گلے سے لگا لیتا ہے۔ پدما فرطِ محبّت سے اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے
لگتی ہے۔

(۱۴)

اندرا اور ہری ہر گھوڑوں پر سوار شہر پناہ کے ایک دروازے پر پہنچتے
ہیں۔ دروازہ بند ہے۔ دوسرے دروازے پر آتے ہیں۔ وہ بھی بند ہے
ہری ہر کو معلوم ہے۔ کہ فصیل میں ایک جگہ شگاف ہے۔ اس پر گھاس پھوس
جمی ہوئی ہے۔ اور کسی کو شاید اس شگاف کی خبر بھی نہ ہو۔ دونوں اسی شگاف
کے اندر گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور کانٹوں سے اُلجھتے اُپلے کے ڈھیروں
کو مٹاتے بمشکل شگاف کو پار کرتے ہیں۔ مگر باہر کی طرف شہر پناہ سے ملی ہوئی ندی
ہے۔ مجبوراً دونوں ندی میں گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور تیرتے ہوئے
ندی کے پار ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب پہنچ کر دونوں ذرا دم لیتے ہیں۔ . . .
. . . .
. . . .
. . . . اور تب پھر بھاگتے ہیں۔ بہت دُور چلنے کے بعد انہیں ایک مندر
ملتا ہے۔ دونوں وہیں گھوڑے کھول دیتے ہیں۔ اور رات بسر کرتے ہیں
صبح کو دونوں وہاں سے پیادہ پا روانہ ہوتے ہیں۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے

ایک بڑے گاؤں میں پہونچتے ہیں۔ وہاں گاؤں کا زمیندار برات لیکر اپنی شادی کرنے جا رہا ہے۔ ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ دوسرے موضعوں کے لوگ بھی تماشا دیکھنے آئے ہیں۔ برات چلنے کو تیار ہے۔ دولہا گھر سے نکل کر موٹر پر بیٹھتا ہے۔ اور موٹر چلنا ہی چاہتا ہے۔ کہ ایک عورت آکر موٹر کے سامنے لیٹ جاتی ہے۔ یہ زمیندار صاحب کی پہلی بیوی ہے۔ جسے انہوں نے پندرہ سال سے چھوڑ رکھا ہے۔ آج وہ اپنی شادی کرنے چلتے ہیں۔ تو بیوی اُن کے راستہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی میں سخت کلامیوں کی نوبت آتی ہے۔ شوہر بیوی کو دھمکا کر راستہ سے ہٹ جانے کا حکم دیتا ہے۔ بیوی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ غصہ میں آکر موٹر چلا دیتا ہے۔ عورت کچل جاتی ہے۔ اُس وقت ہزاروں آدمی غضبناک ہو کر زمیندار صاحب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور اُسے مار ڈالتے ہیں۔ اندرا اور ہری ہر افسوس کرتے ہیں۔ کہ اور پہلے یہاں نہ پہونچے۔ ورنہ شاید سمجھا بجھا کر دونوں میں میل کرا دیتے ذرا دیر اس گاؤں میں ٹھہر کر دونوں پھر آگے بڑھتے ہیں۔ اور شام ہوتے ہوتے ایک شودروں کے گاؤں میں پہنچتے ہیں۔ جہاں ناچ ہو رہا ہے اندرا وہاں گاتی ہے۔ اور انہیں لوگوں کے ساتھ رات بسر کرتی ہے۔

کئی دن کے بعد دونوں اس ریاست کے حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اور سانگلی کی ریاست میں جا پہنچتے ہیں۔ یہیں دونوں ایک گاؤں میں رہنے لگتے ہیں۔ دونوں گاؤں والوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں خوش ہیں۔

گاؤں میں ایک ٹھاکر دوارہ ہے۔ وہیں دونوں رات کو کیرتن کرتے ہیں۔ ان کی خدمت اور بھگتی کا شہرہ قرب وجوار کے مواضعات میں بھی

جاتا ہے۔ اور عقیدتمندوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ اُن دیہاتیوں کی نگاہ میں یہ دونوں آسمانی وجود ہیں۔ اور وہ اُن کی دل وجان سے پرستش کرتے ہیں۔ نغمہ وشعر کی اس دنیا میں دونوں حقیقی وجود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اور دنیاوی کدورتیں اور خواہشیں ان کے دلوں سے نکل جاتی ہیں۔ انہیں ہر ایک وجود میں ایک ہی حقیقت کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہری ہر کبھی کبھی آبشار کے کنارے جا نکلتا ہے۔ اور اُس کے نغمہ میں حقیقت کی آواز سنتا ہے۔ اور روحانیت کے جذبات سے اس کا دل لبریز ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی جنگلی پھول کو دیکھ کر وہ وجد میں آجاتا ہے۔ اور اس میں معبود کا جلوہ دیکھتا ہے۔

ایک دن سانگلی کے کنور صاحب شکار کھیلنے آتے ہیں۔ ان کے ہمراہی برقنداز اور شکاری وغیرہ خیمے لے کر آپہنچتے ہیں۔ شام کا وقت ہے کنور صاحب اپنے ہاتھی پر گاؤں میں آتے ہیں۔ اور شکار کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ اُسی وقت اندرا ان کے روبرو جا کر ایک معرفت کا پد گاتی ہے کنور صاحب کے دل میں لڑکی کی محبت تازہ ہو جاتی ہے۔ پہلی ہی بار جب اُنہوں نے اندرا کو دیکھا تھا۔ اُسے پہچان گئے تھے۔ لیکن اس حالت میں اپنی لڑکی کو تسلیم کرنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی تھی۔ تب سے برابر انہیں اپنی پیاری بیٹی کی یاد بے چین کرتی رہتی تھی۔ لیکن اس دوران میں اُن کی محبت ان خیالات پر غالب آچکی ہے۔ وہ اب ضبط نہیں کر سکتے۔ اور اندرا کو گلے لگا کر کہتے ہیں۔ تو میری کھوئی ہوئی پیاری بیٹی ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ مگر ہری ہر ثروت اور محل کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اُسے اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ کہیں ثروت میں

وہ اندرا کو نہ کھو بیٹھے۔ اندرا سے وہ کچھ نہیں کہتا۔ مگر اِس کے بشرہ سے اُس کے دل کی کیفیت عیاں ہو جاتی ہے۔ اور اندرا اپنے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کرتی ہے۔ مندر کے سامنے جھونپڑی میں دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھر میں کوئی سامان نہیں۔ اُدھر شاہی محل ہے ثروت ہے جاہ و حشم ہے۔ مگر اندرا یہ سب کچھ محبت پر نثار کر دیتی ہے

(۱۵)

اندرا کو محل سے نکال کر اور اُس کی طرف سے بے فکر ہو کر بیدیا کی طبعی شرافت جو کچھ دنوں حسد کے باعث پس پردہ پڑ گئی تھی۔ نمودار ہو جاتی ہے۔ اور وہ دل و جان سے گیان سنگھ کی خدمت کرتی ہے۔ اس یاس و غم کی حالت میں وہ اگر کچھ کھاتا ہے۔ تو اُسی کے اصرار سے سیر کرنے جاتا ہے۔ تو اُسی کے کہنے سے ریاست کے کاروبار دیکھتا ہے۔ تو اُسی کی ایما سے۔ وہ کبھی گیت گا کر، کبھی افسانے سنا کر اس کا دل بہلاتی ہے۔ لیکن اکثر راتوں کو راجہ کی نیند کھل جاتی ہے۔ اور اندرا کو یاد کر کے وہ بیتاب ہو جاتا ہے۔ تب حسد کی آگ اسکے سینہ میں مشتعل ہو جاتی ہے اندرا کسی غیر کی ہو کر رہے۔ یہ اسکے لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ تپسونی بن کر رہتی۔ تو غالباً وہ اس کے قدموں کی خاک ملتھے پر لگاتا۔ مگر وہ کسی غیر کے پہلو میں ہے یہ خیال کر کے اسکے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔
گیان سنگھ کے مخبر اور جاسوس چاروں طرف چھوٹے ہوئے ہیں۔ ایک دن اُسے خبر ملتی ہے۔ کہ اندرا سانگی کے ایک موضع میں ہے گیان سنگھ اسی وقت چند آزمودہ سپاہیوں اور جان نثار رفیقوں کو لے کر

اندرا اور رہری ہر کی تلاش میں چل کھڑا ہوتا ہے۔ پدما اُسے روکتی ہے منتیں کرتی ہے۔ مگر وہ مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ آخر مجبور ہو کر وہ بھی اس کے ساتھ چل کھڑی ہوتی ہے۔ سبھی آدمی گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور ڈبل چال چلے جا رہے ہیں۔ دشوار گذار پہاڑی راستہ ہے۔ گیان سنگھ اور پدما ہمراہیوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ دفعتاً کئی مسلح ڈاکوؤں سے اُن کا سامنا ہو جاتا ہے۔ پدما اپنے پستول سے دو آدمیوں کو واصل جہنم کر دیتی ہے۔ باقی ڈاکو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ کئی دن کے بعد یہ جماعت اِس موضع میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اندرا اور رہری ہر اطمینان اور قناعت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

دم کے دم میں خبر پھیل جاتی ہے۔ کہ راجہ گیان سنگھ اندرا اور رہری ہر کو گرفتار کرنے چڑھ آئے ہیں۔ قرب وجوار کے دہقانی لاٹھیاں اور گنڈاسے اور کلہاڑے لے کر نکل آئے ہیں۔ اور دونوں جماعتوں کے بیچ میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں دیکھتے ہی گیان سنگھ تلوار کھینچکر اُن پر جھپٹتا ہے۔ اندرا اور رہری ہر وہیں سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پرماتما کا دھیان کرنے لگتے ہیں۔ قریب ہے۔ کہ تلوار رہری ہر کی گردن پر پڑے۔ کہ پدما آجاتی ہے۔ اور لپک کر راجہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لیتی ہے۔ دونوں محبت کے شیدائیوں کی یہ جانبازی اور بے نفسی دیکھ کر گیان سنگھ کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کے دل میں دفعتاً اس روشنی کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کے سامنے کمزوریاں اور نفس کی سرکشیاں مٹ جاتی ہیں۔ وہ ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر اندرا کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ پدما آج اُسے ایک ایسے فعل سے

بازدکھ کر جو راجہ صاحب کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیتی اُن کے دل پر فتح پا جاتی ہے۔

گیان سنگھ ایک لمحہ میں اندرا کے قدموں سے اُٹھ کر پدما کو گلے لگا لیتا ہے۔ اندرا بھی پدما کو سینہ سے لگا لیتی ہے۔ پھر ہری ہر اور گیان سنگھ بغلگیر ہوتے ہیں۔

ستی

(۱)

مُلیا کو دیکھتے ہوئے اُس کا شوہر کلو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ مُلیا خوش وخرم ہے۔ اور کلو مغموم اور متفکر؟ مُلیا کو کوڑی ملی ہے۔ اُسے دُوسرا کون پوچھیگا۔ کلو کو جواہر ملا ہے۔ اُس کے سینکڑوں خریدار ہو سکتے ہیں خاصکر اُسے اپنے چچازاد بھائی راجہ سے بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ خوبصورت ہے۔ اور رنگین مزاج۔ باتیں کرنے میں چالاک ہے۔ اور عورتوں کو رجھانا خوب جانتا ہے۔ اِس سے کلو مُلیا کو باہر نہیں نکلنے دیتا۔ اُس پر کسی کی نظر بھی پڑ جائے یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اب شب وروز محنت کرتا ہے۔ تاکہ بکیا کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو۔ اُسے نہ جانے کس جزائے خیر میں یہ عورت ملی ہے اور وہ اُس پر دل وجان قربان کر دینا چاہتا ہے۔ مُلیا کا کبھی سر بھی دُکھتا ہے تو اُس کی جان نکل جاتی ہے۔ مُلیا کا بھی یہی حال ہے۔ کہ جب تک کلو گھر واپس نہیں آتا۔ ماہی بے آب بنی رہتی ہے۔ گاؤں میں کتنے ہی نوجوان

ہیں۔ جو مُلیا سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتے ہیں۔ مگر اُسکی نظروں میں بدصورت کلّو دُنیا کے ہر انسان سے بہتر ہے۔

ایک دن راجہ نے کہا۔ بھابھی، بھیا تمہارے قابل نہیں ہیں۔

مُلیا نے فوراً جواب دیا۔ قسمت میں تو وہی لکھے تھے۔ تمہیں کیونکر پاتی!

راجہ نے دل میں سوچا، اب مار لیا ہے۔ بولا، بھگوان نے بھی تو غلطی کی ہے

مُلیا مُسکرا کر بولی، اپنی غلطی کو وہی ٹھیک کریگا

راجہ خُوش ہو گیا۔

(۲)

تیج کے دن کلّو ملیا کے لئے لٹھے کی ساڑھی لایا۔ جی تو چاہتا تھا۔ کہ کوئی عُمدہ سی ساڑھی لے۔ مگر روپیہ نہ تھے۔ اور بزاز نے اُدھار نہ مانا۔

راجہ بھی اُسی دن قسمت آزمائی کرنی چاہتا تھا۔ ایک عُمدہ سی چُندری لا کر مُلیا کی نذر کی۔

مُلیا نے کہا۔ میرے لئے تو ساڑھی آ گئی ہے۔

راجہ بولا۔ میں نے دیکھی ہے۔ جبھی تو اسے لایا ہوں۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ بھیا کو کفایت بھی سوجھتی ہے۔ تو ایسی باتوں میں۔

مُلیا نے ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر کہا، تم سمجھا کیوں نہیں دیتے؟

راجہ پر ایک پیالے کا نشہ چڑھ گیا۔ بولا۔ بڈھا طوطا کہیں پڑھتا ہے؟

ملیا۔ مجھے تو لٹھے کی ساڑھی پسند ہے۔

راجہ۔ ذرا یہ چندری پہن کر تو دیکھو۔ کیسی کھلتی ہے۔

ملیا۔ جو لٹھا پہنا کر خوش ہوتا ہے۔ وہ چندری پہننے سے خوش نہ ہوگا۔

اُسے چندری پسند ہوتی۔ تو چندری ہی لاتا۔

راجہ۔ انہیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ملیا نے تعجب سے کہا۔ تو کیا میں ان سے بغیر پوچھے لے لونگی۔

راجہ۔ ایسا میں پوچھنے کی کونسی بات ہے۔ جب وہ کام پر چلے جائیں تب پہن لینا۔ میں بھی دیکھ لونگا۔ ملیا قہقہہ مار کر ہنستی ہوئی بولی۔ یہ نہ ہوگا دیور جی۔ کہیں دیکھ لیں۔ تو میری شامت ہی آ جائے۔ اِسے تم لیتے جاؤ۔

راجہ نے پُر بضد ہو کر کہا۔ ایسے نہ لوگی بھابھی، تو میں زہر کھا کر سو رہونگا؟

ملیا نے ساڑی اُٹھا کر طاق پر رکھ دی اور بولی لے لو اب تو خوش ہو!

راجہ نے انگلی پکڑی۔ ابھی تو پہنا نہیں ہیں۔ ذرا پہن لو۔

ملیا نے اندر جا کر ساڑی پہن لی۔ اور پھول کی طرح مہکتی۔ دمکتی باہر آئی۔

راجہ نے ہاتھ پکڑنے کو ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔

ملیا نے اُسی سرور انگیز انداز سے جواب دیا۔ جانتے ہو تمہارے بھیا کا کیا حال ہوگا۔؟

یہ کہکر ملیا نے کواڑ بند کر لئے۔ راجہ کو ایسا معلوم ہؤا۔ گویا سامنے سے پروسی ہوئی تھالی اٹھالی گئی۔

(۳)

ملیا کا جی تو یہی کہتا تھا۔ کہ چندری کا کونڈ کھادے۔ مگر نتیجہ سوچ کر ہمت نہ پڑتی تھی۔ اُس نے چندری رکھ کیوں لی۔ اُسے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا لیکن راجہ کو کتنا رنج ہوتا؟ کیا ہؤا اُسکی چندری ذرا دیر پہن لینے سے اُس کا دل تورہ گیا

لیکن اُس کے دل کی ساکت گہرائیوں میں یہ ایک کیڑا جیسے اسے منغض رہا تھا اُس نے کیوں چندری رکھ لی۔ کیا یہ کلو کے ساتھ دغا نہیں تھی۔ اُس کا دل اِس خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔ اُس نے دل کو سمجھایا۔ دغا کیوں ہوئی۔ اِس میں دغا کی کون سی بات ہے۔؟ کیا وہ راجہ سے بولی؟ ذرا سا ہنس دینے سے اگر کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ تو اُس میں ہرج ہی کیا ہے۔

کلو نے پوچھا۔ آج رجو کیا کرنے آیا تھا؟

مُلیا کا بدن کانپنے لگا۔ بہانہ کر کے بولی۔ تمبا کو مانگنے آئے تھے۔

کلو نے ناک سکوڑ کر کہا۔ اُسے اندر مت آنے دیا کرو، اچھا آدمی نہیں ہے

مُلیا۔ میں نے کہدیا تمباکو نہیں ہے، تو چلے گئے۔

کلو نے کسی قدر تیز ہو کر کہا، کیوں جھوٹ بولتی ہو؟۔ وہ تمباکو مانگنے نہیں آیا تھا۔

مُلیا۔ تو اور یہاں کیا کرنے آتے؟

کلو۔ اور کسی کام سے آیا ہو، مگر تمباکو مانگنے نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا۔ میرے گھر میں تمباکو نہیں ہے۔ میں تمباکو کے لئے خود ہی اُسکے گھر گیا تھا۔

مُلیا کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ سر جھکا کر بولی۔ میں کسی کے من کا حال کیا جانوں۔؟

آج تیج کا برت تھا۔ ملیا پوجا کا سامان کر رہی تھی۔ پر اِس طرح گویا اُس کے دل میں ذرا بھی اعتقاد ذرا بھی شوق نہیں ہے۔

اُسے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ اُسکے مُنہ میں کالکھ پُت گئی ہے۔ اور اب وہ کلو کی آنکھوں سے گر گئی ہے۔ اُسے اپنی زندگی ویران نظر آتی ہے۔ سوچنے لگی۔ بھگوان نے مجھے یہ حُسن کیوں دیا۔؟ یہ روپ نہ ہوتا۔ تو راجہ

کیوں میرے پیچھے پڑتا۔ اور کیوں آج میری یہ حالت ہوتی ؟ میں کالی اور بدصورت ہو کر اُس سے کہیں زیادہ سُکھی ہوتی۔ تب تو دل اتنا چنچل نہ ہوتا۔ جنہیں روپ کی کمائی کھانی ہو، وہ روپ کو لیکر جائیں۔ یہاں تو اُس نے زندگی برباد کر دی

نہ جانے کب اُسے نیند لگ گئی۔ تو دیکھتی ہے، کلو مر گیا ہے۔ اور راجہ گھر میں گھُسکر اُسے پکڑنا چاہتا ہے۔ اُسی وقت ایک بوڑھی عورت نہ جانے کدھر سے آکر اُسے گود میں لے لیتی ہے اور کہتی ہے۔ تو نے کلو کو کیوں مار ڈالا ؟ مُلیا رو رو کر جواب دیتی ہے۔ ماں۔ میں نے اُنہیں نہیں مارا۔ بڈھیا جواب میں کہتی ہے ہاں تو نے اُنہیں چھُری کٹار سے نہیں مارا۔ لیکن تیری دغا کٹار سے زیادہ قاتل تھی

مُلیا رو دی۔

مُلیا نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ تو سامنے صحن میں کلو سو رہا تھا۔ وہ دوڑی ہوئی اُسکے پاس گئی۔ اور اُسکی چھاتی پہ سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کلو نے گھبرا کر پوچھا۔ کون ہے ؟ مُولا کیوں روتی ہو ؟۔ کیا ڈر گئیں۔ میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔

مُلیا نے سِسکی لیکر کہا۔ مجھ سے آج ایک خطا ہو گئی۔ اسے معاف کرو،

کلو اُٹھ بیٹھا اور بولا۔ کیا بات ہے ۔؟ کہو تو کیوں روتی ہو؟

مُلیا۔ راجہ نمبا کو مانگنے نہیں آیا تھا۔ میں نے تم سے جھُوٹ کہا تھا۔

کلو ہنس کر بولا۔ وہ تو میں پہلے ہی سے سمجھ رہا تھا۔

مُلیا۔ وہ میرے لئے ایک چندری لائے تھے۔

"تم نے لوٹا دی نہ،،

مُلیا کانپتی ہوئی بولی میں نے لے لی۔ کہتے تھے میں زہر کھا لونگا۔

کلو۔ لمبی سانس کھینچکر چارپائی پر گر پڑا۔ اور بولا۔ روپ تو میرے بس کی

بات نہیں ہے۔ بھگوان نے بدصورت بنا دیا۔ تو سندر کہاں سے ہو جاؤں۔
کلو نے اگر ملیا کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا ہوتا۔ تو بھی اُسے اتنا
درد نہ ہوتا۔

(۴)

ملو اس دن سے کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ زندگی میں نہ وہ شوق رہا۔
اور نہ وہ مزہ۔ ہنستا بولنا گویا بھول گیا۔ ملیا نے اس کے ساتھ جتنی دغا کی تھی۔
اس سے کہیں زیادہ اُس نے سمجھ لیا۔ اور یہی شُبہ اُس کے دل میں سرطان
کی طرح چمٹ گیا۔ وہ گھر اب اس کے لئے صرف اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور
ملیا صرف کھانا پکانے والی مشین۔ خط نفس کے لئے وہ کبھی کبھی تاڑی خانے
چلا جاتا یا چرس کے دم لگاتا۔
ملیا اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کُڑھتی تھی۔ وہ اُس شُبہ کو اُس
کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اس لئے دل و جان سے اُسکی خدمت کرتی۔
اُسے خوش رکھنے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی۔ مگر وہ جتنا ہی اسے کھینچنے کی کوشش
کرتی۔ اتنا ہی، دُور وہ اُس سے کھینچتا تھا۔ گویا کوئی کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی ہو۔ غنیمت یہ
ہوئی۔ کہ راجہ جس انگریز کے یہاں نوکر تھا۔ اُس کا تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ اُس کے ساتھ چلا
گیا۔ نہیں تو دونوں بھائیوں میں کسی نہ کسی کا ضرور خون ہو جاتا۔ اس طرح سال بھر اور گذرا
ایک دن کلو رات کو گھر لوٹا۔ تو اس کو تو بخار تھا۔ دوسرے دن اُسکے جسم میں
دانے نکل آئے۔ ملیا نے خیال کیا۔ ماتا ہیں۔ مان منوتی کرنے لگی۔ مگر چار پانچ دن ہی
میں دانے بڑھ کر آبلے ہو گئے۔ اور معلوم ہوا یہ ماتا نہیں ہے۔ گرمی ہے۔ کلو کی
خرمستی یہ رنگ لائی تھی۔

بیماری سیلاب کی رفتار سے بڑھنے لگی۔ آبلوں میں مواد پڑ گیا۔ اور ان میں سے ایسی بدبو نکلنے لگی۔ کہ پاس بیٹھتے ناک پھٹتی تھی۔ دیہات میں جس طرح کا علاج ہو سکتا تھا۔ وہ ملیا کرتی تھی۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہو رہا تھا۔ اور کلو کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ علاج کے لئے پیسے کی بھی ضرورت تھی اور ملیا کو اب محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ کلو ادھر اپنے کئے کا پھل بھوگ رہا تھا۔ ملیا ادھر دوا داروں میں مری جاتی تھی۔ اگر کچھ صبر تھا۔ تو یہی کہ کلو کا اندیشہ اور شبہ اس کی اس خدمتگذاری سے دور ہو جاتا تھا۔ اسے اب یقین ہو رہا تھا۔ کہ ملیا اب بھی اس کی ہی ہے۔ وہ اگر کسی طرح اچھا ہو جاتا۔ تو پھر اسے دل میں چھپا کر رکھتا اور اس کی پرستش کرتا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ملیا نے کلو کا ہاتھ منہہ دھلا کر دوا پلائی اور کھڑی پنکھا جھل رہی تھی۔ کہ کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "ملیا" میں نے پچھلے جنم میں کوئی بھاری تپ کیا تھا۔ کہ تم مجھے مل گئیں۔ تمہاری جگہ اگر مجھے دنیا کا راج بھی ملے تو نہ لوں۔

ملیا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر لیا اور بولی۔ اگر اس طرح کی باتیں کرو گے۔ تو میں رونے لگوں گی۔ میں بڑی قسمت ور تھی۔ کہ تم جیسا شوہر پایا یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ شوہر کے گلے میں ڈال دئے۔ اور بولی۔ بھگوان نے مجھے میرے پاپوں کا بدلہ دیا ہے۔ کلو نے پرخلوص نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ سچ کہو۔ مولا راجہ اور تم میں کیا معاملہ تھا۔

ملیا نے حیرت میں آ کر کہا۔ میرے اور ان میں اگر اور کوئی معاملہ ہو۔ تو بھگوان میری اس سے بری حالت کریں۔ اس نے مجھے چندری دی تھی۔ وہ میں نے لی تھی۔ پھر میں نے اسے آگ میں جلا دیا۔ تب سے میں اس سے

نہیں بولی۔

کلو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ میں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا تھا۔ نہ جانے میری سمجھ کہاں غائب ہو گئی تھی؟ تمہیں پاپ لگا کر میں خود ہی پاپ میں پھنس گیا۔ اور اب اُس کا پھل بھوگ رہا ہوں۔

اُس نے رو رو کر اپنی بے راہ روی کا پردہ فاش کرنا شروع کیا۔ اور مُلیا آنسو کی لڑیاں بہا بہا کر سننے لگی۔ اگر شوہر کی فکر نہ ہوتی۔ تو اس نے زہر کھا لیا ہوتا۔

کئی مہینے بعد راجہ چھٹی لے کر گھر آیا۔ اور کلو کی مہلک بیماری کا حال سنا۔ تو بہت خوش ہُوا۔ تیمارداری کے بہانے سے کلو کے گھر آنے جانے لگا۔ کلو اسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیتا۔ لیکن وہ دل میں دو چار بار پہنچ ہی جاتا تھا۔

ایک دن مُلیا کھانا پکا رہی تھی۔ کہ راجہ نے رسوئیں کے دروازے پر آ کر کہا بھابھی کیا اب بھی مجھ پر مہربانی نہ ہو گی؟ کتنی بے رحم ہو تم؟ کئی دن سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ مگر تم مجھ سے بھاگتی پھرتی ہو۔ بھیا اب اچھے نہ ہونگے۔ انہیں گری ہو گئی ہے۔ اُن کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کر رہی ہو؟ تمہارا گلاب سا بدن سوکھ گیا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ کچھ زندگی کے مزے اُڑائیں۔ یہ جوانی بہت دن نہیں رہیگی یہ دیکھو تمہارے لئے ایک کرن پھول لایا ہوں۔ ذرا پہن کر مجھے دکھا دو۔

اس نے کرن پھول مُلیا کی طرف بڑھا دیا۔ مُلیا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں چولھے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ لالہ، تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ مجھے مت چھیڑو۔ یہ ساری مصیبت تمہاری لائی ہوئی ہے۔ تمہیں میرے دشمن ہو۔ پھر بھی تمہیں شرم نہیں معلوم ہوتی۔ کہتے ہو بھیا اب کس کام کے ہیں؟ مجھے تو اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ تب میں نہ ہوتی۔ تو وہ دوسری سگائی کر لیتے۔ اپنے ہاتھوں ٹھونک کھاتے۔ آج میں ہی اُن کا سہارا ہوں۔ وہ میرے سہارے زندہ ہیں۔ اگر

اِس مصیبت میں ہیں۔ اُن سے دُگا کروں۔ تو مجھ سے بڑھ کر پاپی اور کون ہوگا!
اور جب میں جانتی ہوں۔ کہ اِس مصیبت کا کارن بھی میں ہی ہوں۔
راجہ نے ہنس کر کہا۔ یہ تو وہی ہوا۔ جیسے کسی کی دال گر گئی۔ تو اُس نے کہا۔ مجھے تو سوکھی ہی اچھی لگتی ہے۔

مُلیا نے نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم اُن کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو۔ لالہ بکنے کیا ہو؟ اُجلے کپڑے اور چکنے مکھڑے سے کوئی آدمی نہیں ہو جاتا۔ میری آنکھوں میں تو اب اُن کے سامنے کوئی جچتا نہیں۔

کلو نے پکارا، مولا تھوڑا پانی دے۔ مُلیا پانی لے کر دوڑی۔ چلتے چلتے کرن پھول کو ایسا ٹھکرایا کہ صحن میں جا کر گرا۔ راجہ نے جلدی سے کرن پھول اٹھا لیا، اور غصہ میں چلا گیا۔

(۵)

کلو کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ معقول علاج ہوتا۔ تو شائد اچھا ہو جاتا مگر اکیلی مُلیا کیا کیا کرتی۔ غریبی میں بیماری کوڑھ میں کھاج ہے۔

آخر ایک دن ملک الموت کا پیغام آ ہی پہنچا۔ مُلیا گھر کا کام کاج کر کے آئی۔ تو دیکھا کلو کی سانس زور زور چل رہی ہے۔ گھبرا کر بولی کیسی طبیعت ہے، تمہاری؟

کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ہاتھ جوڑے اور سر نیچا کر لیا۔ یہ دم واپسیں تھا مُلیا اُس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اور ہذیان کے عالم میں بولی۔ تم سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا بھگوان بعد اُس پھر تو کہلاتے ہو۔ اِسی لئے مجھے پیدا کیا تھا۔ یہی تماشہ دکھانے کے لئے ہائے میرے سرتاج! تم تو اتنے بے درد نہ تھے۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جا رہے ہو۔ ہائے! اب کون مولا کہہ کر پکارے گا!

اب کس کے لئے کوئیں سے .. پانی بھر لاؤں گی ؟ کسے بیٹھا کر کھلاؤں گی ۔ کِسے
پنکھا ڈلاؤں گی ۔ بھگوان ! سب کچھ لیا تو مجھے کیوں نہیں لے چلتے ۔
سارا گاؤں جمع ہو گیا ۔ سبھی سمجھا رہے تھے ۔ مُلیا کو صبر نہ ہوتا تھا ۔ یہ سب
میری وجہ سے ہوُا ۔ یہ بات اُسے نہیں بھولتی !

(۶)

کلو کو مرے چھ مہینے ہو گئے ۔ مُلیا کماتی ہے کھاتی ہے ۔ اور اپنے گھر
میں پڑی رہتی ہے ۔ دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی ۔ ہاں رات کو اکیلے
میں بیٹھ کر کچھ دیر رو لیا کرتی ہے ۔
ادھر راجہ کی عورت بھی مر گئی ۔ مگر دو ہی چار دن کے بعد وہ پھر چھیلا بنا گھومنے
لگا ۔ اب اور بھی چھوٹا سانڈ ہو گیا ۔ پہلے عورت سے لڑائی ہو جانے کا خوف تھا ۔
اب وہ بھی نہیں رہا ۔ اب کی نوکری سے لوٹا تو سیدھا ملیا کے گھر پہونچا ۔ اور اِدھر اُدھر
کی باتوں کے بعد بولا ۔ بھابھی اب تو میری امید پوری کرو گی ۔ یا ابھی کچھ اور بھی باقی
ہے ؟ اب تو بھیا بھی نہیں رہے ۔ اور اِدھر میرے گھر والی بھی مر گئی ۔ میں نے
تو اس کا غم بھُلا دیا ۔ تم کب تک بھیا کے نام کو روتی رہو گی ۔
مُلیا نے نفرت سے اسکی طرف دیکھ کر کہا ۔ بھیا نہیں رہے تو کیا ہُوا ! بھیا
کی یاد تو ہے ۔ اُن کی محبت تو ہے ۔ اُن کی صورت تو دل میں ہے ۔ اُن کی باتیں تو کانوں
میں ہیں ۔ میرے لئے وہ اب بھی ویسے ہی جیتے جاگتے ہیں ۔ میں اب بھی اُنہیں
ویسے ہی بیٹھا ہُوا دیکھتی ہوں ۔ پہلے تو بدن کا بیچ تھا ۔ اب تو وہ مجھ سے اور بھی
قریب ہو گئے ہیں ۔ اور جیوں جیوں دن گذرینگے ۔ اور بھی قریب ہوتے جائینگے ۔
بھرے پُرے گھر میں دانے کی کون قدر کرتا ہے ۔ جب گھر خالی ہو جاتا ہے ۔ تب

معلوم ہوتا ہے۔ کہ دانہ کیا چیز ہے؟ پیسے والے پیسے کی قدر کیا جانیں، پیسے کی قدر تب ہوتی ہے۔ جب ہاتھ خالی ہو جاتا ہے۔ اُس وقت آدمی ایک ایک کوڑی کو دانت سے اُٹھاتا ہے۔ تمہیں بھگوان نے دل ہی نہیں دیا۔ تم کیا جانو۔ محبت کیا چیز ہے۔ گھر والی کو مرے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے۔ اور تم سانڈ بنے پھرتے ہو؟ تم مر گئے ہوتے تو اسی طرح وہ بھی اب تک کسی کے پاس چلی گئی ہوتی۔ مگر میں جانتی ہوں۔ میں مر جاتی تو میرا سرتاج عمر بھر میرے نام کو رویا کرتا۔ ایسے ہی مردوں کی عورتیں ان پر جان دیتی ہیں۔ تم جیسے شہدوں کی قسمت میں دوسروں کا جوٹھا کھانا ہی بُرا ہے۔ کھاؤ۔ مگر خبردار آج سے میرے گھر میں پاؤں مت رکھنا۔ نہیں تو جان سے ہاتھ دھوؤ گے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔

چہرے پر اتنا جلال اور لہجہ میں اتنی تندی تھی۔ کہ راجہ کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چپکے سے نکل گیا۔
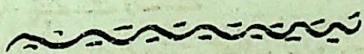
ادیب کی عزت

(۱)

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے کا پیالہ تیار کیا اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی ان کا ناشتہ تھا۔ دودھ اور چینی اُن کے لئے ضروریات زندگی میں نہیں۔ گھر میں گئے ضرور۔ کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں۔ پر اُسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید مارے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی۔ اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے۔ کچی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا۔ چپکے سے لوٹ گئے۔

چائے پی کر انہوں نے قلم دوات سنبھالی۔ اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہو گئے۔ جو اُن کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی۔ جس کی اشاعت انہیں قعر گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچا دیگی۔ آدھ گھنٹے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آکر بولی۔ چائے پی چکے۔ قمر نے خوش

ہوکر جواب دیا۔ ہاں پی چکا۔ بہت اچھی بنی تھی۔

"مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے۔؟"

"آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے ہاں کے چینی خود رئیسوں کی ایجاد ہے"

"جانے آپ کو پھیکی چائے کیونکر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے جگا کیوں نہ لیا۔ پیسے تو رکھے تھے"

قمر نے جواب نہ دیا۔ پھر لکھنے لگے۔ جوانی ہی میں انہیں یہ بیماری لگ گئی تھی۔ اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے۔ انہوں نے کسب معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت گھل گئی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آ کر گھیرا۔ مگر یہ مرض مزمن لاعلاج تھا۔ طلوع آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکر سخن میں غرق رہتا تھا۔ پر ہندوستان میں سرسوتی[1] کی پوجا لکشمی[2] کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا۔ دو دو دیویوں کو ایک ساتھ کیونکر خوش کرتے۔ اور لکشمی کی یہ ناراضی صرف افلاس کی شکل و صورت ہی میں نہ ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی سب سے بھیانک صورت یہ تھی۔ کہ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر دل کھول کر داد بھی نہ دیتے تھے۔ جیسے ساری دنیا نے ان کے خلاف سازش کر لی ہو۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے اوپر مطلق اعتماد نہ تھا۔ اب انہیں یہ شبہ ہونے لگا تھا۔ کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں۔ اور یہ انکشاف بدرجہ غائیت ہمت شکن تھا۔ یہ عمر عزیز.....

[1] علم کی دیوی۔ [2] دولت کی دیوی

یوں ہی تلف ہو گئی - یہ تسکین بھی نہیں - کہ دنیا نے نا قدری کی ہو - مگر ان کا کارنامہ حیات حقیر نہیں - ضروریات زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں اگر کوئی تسکین تھی - تو محض یہ کہ اُن کی رفیق حیات ترک و ایثار میں اُن سے بھی بڑھی ہوئی تھی - سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی - قمر کو دُنیا سے شکایت ہو مگر سکینہ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتی رہتی تھی - اپنے نصیبوں کو رونا تو دُور کی بات تھی - اس دیوی نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا -

سکینہ نے چائے کا پیالہ سمیٹتے ہوئے کہا - تو جا کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے - جب معلوم ہو گیا کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بے کار کیوں سر کھپاتے ہو -

قمر نے بغیر قلم اٹھائے کہا - لکھتے ہیں کم از کم یہ تسلّی تو ہوتی ہے - کہ کچھ کر رہا ہوں - سیر کرتے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے - کہ وقت ضایع ہو رہا ہے "

" یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی جو ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں - تو یہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں "

" مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا - زیادہ تر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں - جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے یا ایسے پیشوں کے لوگ ہوتے ہیں - جن کی عوام میں عزت ہے - میں تو قلم کا مزدور ہوں - تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے - جنہیں کھانے کی کمی نہیں - انہیں ہوا کی ضرورت ہے - جنہیں روٹیوں کے لالے ہیں - وہ ہوا کیا کھائینگے پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی انہی کو ضرورت ہے - جن کو زندگی کے عیش و آرام میسر ہیں - میرے لئے تو زندگی محض بار ہے - اس بار کو سر پر کچھ دن اور اُٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے نہیں ہے -

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سُنکر آنکھوں میں آنسو بھرے اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا۔ اِس تپ کا پھل ایک دن اُنہیں ضرور ملیگا۔ دولت حاصل ہو یا نہ ہو۔ لیکن قمر صاحب یاس کی اُس حد تک جا پہنچے تھے۔ جہاں سے سمت مخالف میں طلوع ہونے والی اُمید کی سرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

(۲)

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اُس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے آج اُن کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا ہے سارے دن وہ اِسی تخیل میں محو رہے۔ راجہ صاحب کن الفاظ میں اُن کا خیر مقدم کریں گے۔ اور وہ کن الفاظ میں اُن کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہوگی۔ اور کن اصحاب سے اُن کا تعارف کرایا جائیگا۔ سارے دن وہ اپنی خیالات کے لطف اٹھاتے رہے اس موقعہ کے لئے انہوں نے ایک نظم بھی تیار کی۔ جس میں انہوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی۔ سراب ہستی اُن کے زور طبع کے لئے زیادہ موزوں چیز تھی۔ مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے انہوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنائی۔ صابن سے نہائے۔ سر میں تیل ڈالا۔ دِقّت کپڑوں کی تھی۔ مدت گزری جب انہوں نے ایک اچکن بنوائی تھی۔ اس کی حالت بھی قمر کی سی تھی۔ جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے انہیں زکام یا سر درد ہو جاتا تھا۔ اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی۔ اُسے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا۔ تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا۔ لکھ دیتے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ اِن پھٹے حالوں جانا تو اور بھی بُرا ہے۔ قمر نے فلاسفروں کی سی

سنجیدگی سے کہا۔ جنہیں پرماتما نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے۔ اُن کے ہنر دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ بات تو ہے۔ کہ راجہ صاحب نے مجھے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدیدار نہیں، زمیندار نہیں، جاگیردار نہیں، ٹھیکیدار نہیں معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے مجھے کسی بھی شاعر کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں "۔

سکینہ اُن کی سادگی پر ترس کھا کر بولی۔ تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہو۔ میں کہتی ہوں راجہ صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی بیوقوف ہی بن جائے "۔

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہل نظر کی طرح اُنہیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ بولے۔ میرا خیال ہے۔ چراغ جل جانے کے بعد جاؤں۔

"میں تو کہتی ہوں۔ جاؤ ہی کیوں"

"اب تم کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر ایک شخص کے دل میں اعزاز واحترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی۔ یہ بھوک کیوں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اُس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصہ ہیں۔ جو ساری دُنیا میں حاضر ناظر ہے۔ جز میں کل کی خوبیاں ہونا امر لازمی ہے۔ اس لئے جاہ و رفعت علم و فضل، کی جانب ہمارا فطری میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں چونکہ دل میں ضعف ہے۔ اہل دُنیا کی حرف گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامن گیر ہو جاتا ہے۔

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لئے کہا۔ اچھا بھئی! جاؤ۔ میں تم سے بحث

نہیں کرتی۔ لیکن کل کے لئے کوئی سبیل سوچتے جاؤ۔ کیونکہ میرے پاس صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے۔ جن سے قرض مل سکتا تھا۔ اُن سے لے چکی۔ اور جس سے لیا، اُسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

قمر نے ایک لمحہ کے بعد کہا۔ "دو ایک اخباروں سے روپیہ آنے والا ہے شاید کل تک آجائے۔ اور اگر کل فاقہ کشی ہی کرنی پڑے تو کیا فکر ہے۔ ہمارا فرض کام کرنا ہے۔ ہم کام کرتے ہیں۔ اور دل وجان سے کرتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤنگا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ میں تو کبیر پنتھیوں کا قائل ہوں جو گاتے بجاتے ہوئے جنازے کو لے جاتے ہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں۔ اُس سے زیادہ میرے امکان میں ہے؟ ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے۔ اور میں قلم لئے بیٹھا ہوتا ہوں۔ لوگ سیر و تفریح کرتے ہیں۔ کھیلتے کودتے ہیں۔ میرے لئے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ عید کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں جب بھی لکھتا ہوں۔ سوچو تم بیمار تھیں۔ اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لئے بھی وقت نہ تھا۔ اگر دُنیا نہیں قدر کرتی، نہ کرے اِس میں دُنیا ہی کا نقصان ہے۔ میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اُس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے۔ اُسے اِس سے کوئی مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست شناسا یا رشتہ دار ہے۔ جس کا میں شرمندہ احسان نہیں۔ یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدنیت تصور نہیں کرتے۔

وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کر سکیں۔ مگر انہیں مجھ سے ہمدردی ہے۔ میری خوشی کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے۔

پھر معاً اُن پر ایک نشہ چھا گیا۔ غرور سے بولے۔ نہیں میں اب رات کو نہ جاؤنگا۔ میرا افلاس رسوائی کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اُس کی پردہ پوشی کرنا بیکار ہے۔ میں اسی وقت جاؤنگا۔ جسے راجہ لوگ مدعو کریں۔ وہ ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ راجہ صاحب معمولی رئیس نہیں ہیں۔ وہ اسی شہر کے نہیں ہندوستان بھر کے مشہور آدمی ہیں۔ اگر اب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے۔ تو اُس کی عقل کا قصور ہے۔

(۳)

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پرانی اچکن اور سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے۔ تو گنوار لپچکے سے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے۔ تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی فربہی بجائے خود اک بارعب شے ہے۔ مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں، چراغ کا کام جلنا ہے۔ چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا، جو جلا نہیں، پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دوکانداروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے۔ مگر آج وہ گردن اُٹھائے اُن کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ اُن کے تقاضوں کا دنداں شکن جواب دینے کو تیار تھے۔ مگر شام کا وقت تھا۔ ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کوئی اُن کی طرف نہیں دیکھتا۔ جس رقم کو وہ بہت زیادہ

سمجھتے تھے۔ وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمولی تھی۔ کم از کم ایسی نہ تھی جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اُتار کر رکھ دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا۔ پر جی نہ بھرا۔ تب دوسرا چکر لگایا۔ اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ تب؟ خود حافظ صمد کی دکان پہ جا کر کھڑے ہو گئے۔ حافظ صاحب بساطی کا کام کرتے تھے۔ بہت دن ہوئے۔ قمر اس دوکان سے ایک چھاتا لے گئے تھے۔ اور ابھی تک دام نہ چکا سکے تھے۔ قمر کو دیکھ کر بولے۔ واہ حضرت! ابھی تک چھاتے کے دام نہیں ملے۔ ایسے سو پچاس گاہک مل جائیں۔ تو دیوالہ نکل جائے۔ اب تو دن بہت ہو گئے۔

حضرت قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مراد پوری ہوئی۔ بولے۔ میں بھولا نہیں ہوں! حافظ صاحب! ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی۔ کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ روپیہ تو ہاتھ نہیں آتا۔ ہاں آپ کی دعا سے قدرشناسوں کی کمی نہیں ہے۔ دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں۔ زندگی وبال ہے۔

اس وقت بھی راجہ صاحب .... اجی وہی جو نگرہ والے بنگلے میں رہتے ہیں۔ انہیں کے یہاں جا رہا ہوں۔ روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقعہ آتا رہتا ہے،،

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے۔ اچھا آپ راجہ صاحب کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ آپ جیسے باکمالوں کی قدر رئیس ہی کر سکتے ہیں۔ اور کون کریگا۔ سبحان اللہ! آپ اس وقت یکتا ہیں۔ اگر کوئی موقعہ ہاتھ آئے تو غریب کو نہ بھول جائیگا۔ راجہ صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے۔ تو پھر کیا پوچھنا ایک پورا باطہ تو انہی کے لئے درکار ہے۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔

قمر کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی۔ زبانی جمع خرچ ہے تو بیس لاکھ کہنے میں کیا حرج ہے۔ بولے۔ ڈھائی تین لاکھ! آپ تو انہیں گالیاں دیتے ہیں۔ اُن کی آمدنی دس لاکھ سے کم نہیں۔ ایک صاحب کا اندازہ تو بیس لاکھ کا ہے۔ علاقہ ہے۔ مکان ہیں۔ دوکانیں ہیں۔ ٹھیکہ ہے۔ امانتی روپے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ سرکار بہادر کی نگاہ ہے۔

حافظ نے بڑے عجز سے کہا۔ یہ دکان آپ کی ہے۔ جناب۔ بس اتنی ہی عرض ہے۔ اے مرادی! ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بنوا لا آپ کے لئے۔ آئیے دو منٹ بیٹھئے۔ کوئی چیز دکھاؤں گا۔ آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا۔ اِس وقت تو معاف رکھئے۔ وہاں دیر ہوگی پھر کبھی حاضر ہوں گا۔

یہاں سے اُٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دکان پر رُکے۔ منوہر داس نام تھا۔ انہیں کھڑے دیکھ کر آنکھیں اٹھائیں۔ بیچارہ اُن کے نام کو رو بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا۔ شاید کہیں چلے گئے۔ سمجھا روپے دینے آئے ہیں۔ بولا بھائی! آپ نے تو بہت دنوں سے درشن ہی نہیں دئے۔ کئی بار رقعہ بھیجا۔ مگر آدمی کو آپ کے مکان کا پتہ ہی نہ ملا۔ منیم جی ذرا دیکھو۔ تو آپ کے نام کیا نکلتا ہے؟

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی۔ لیکن آج اِس طرح بے فکر کھڑے تھے۔ جیسے کوئی آہنی خود پہن لیا ہو۔ جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ بولے ذرا اِن راجہ صاحب کے یہاں ہو آؤں تو بے فکر ہو کر بیٹھوں۔ اِس وقت جلدی میں ہوں۔

راجہ صاحب پر منوہر داس کے کئی ہزار روپے نکلتے تھے۔ پھر بھی ان کا دامن نہ چھوڑتا تھا۔ ایک کے تین وصول کرتا۔ اُس نے قمر کو بھی اِسی جماعت میں

رکھ لیا۔ جس کا پیشہ رئیسوں کو لوٹنا ہے۔ بولا۔ پان تو کھاتے جائیے۔ جناب راجہ صاحب ایک دن کے ہیں ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں۔ کچھ کپڑا درکار ہو تو لے جائیے۔ عید آ رہی ہے۔ موقعہ ملے تو راجہ صاحب کے خزانچی سے کہنا۔ پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہوا ہے۔ اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کون سا نفع لے لیتے ہیں۔ کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو۔

قمر بولے۔ اس وقت تو پان دان رہنے دو۔ بھائی دیر ہو جائیگی۔ جب انہیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے۔ اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں۔ تو میرا بھی فرض ہے۔ کہ انہیں تکلیف نہ ہونے دوں۔ ہم تو قدردانی چاہتے ہیں۔ دولت کے بھوکے نہیں۔ کوئی ہمیں چاہے، تو ہم اس کے غلام ہیں۔ کسی کو ریاست کا غرور ہے تو ہمیں بھی اپنے علم و کمال کا غرور ہے۔

(۴)

حضرت قمر راجہ صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے۔ تو دئے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں۔ دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ قمر کو دیکھکر وہ ذرا جھجکے۔ پھر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھکر بولے۔ آپ کے پاس کارڈ ہے؟ قمر صاحب کی جیب میں تھا۔ مگر اس مطلب سے انہیں غصہ آ گیا۔ انہی سے کیوں کارڈ مانگا گیا۔ اوروں سے تو کوئی نہیں پوچھتا۔ بولے جی نہیں۔ میرے پاس کوئی کارڈ نہیں۔ اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا۔ ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ راجہ صاحب سے کہہ دیجئے گا۔ قمر آیا تھا۔ لوٹ گیا

"نہیں نہیں جناب! اندر چلئے۔ آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمائیے

آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے۔ خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ :-

اُس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اُس نے جو کچھ کہا۔ وہ ہر ایک مصنف ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی ادیب اس داد سے مستغنی نہیں۔ قمر اندر پہنچے تو دیکھا۔ کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطہ میں بجلی کے لیمپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری پری کے سر پر فوارہ۔ فوارے کی پھواریں رنگین لیمپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے قوس قزح پگھل کر برس رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر سفید میز پوش۔ اُن پر خوبصورت گلدستے۔

قمر کو دیکھتے ہی راجہ صاحب نے خیر مقدم کیا۔ آئیے آئیے۔ اب کے انیس ہند میں آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ اِس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں۔

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے۔ آپ نے حضرت قمر کا نام تو سُنا ہو گا۔ وہ آپ ہی ہیں۔ کیا شیریں ہے۔ کیا جدت ہے۔ کیا تخیل ہے کیا روانی ہے۔ کیا ندرت ہے کہ واہ واہ! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناچنے لگتا ہے۔

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے۔ قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور ہوں اور بولے۔ آپ نے انگریزی شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ بائرن۔ شیلے۔ کیٹس وغیرہ۔

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ جی ہاں، تھوڑا بہت دیکھا ہے"

"آپ اُن استادانِ فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کردیں۔ تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں"

قمر اپنے آپ کو بائرن، شیلے سے جو بھر کم نہ سمجھتے تھے۔ بولے۔ ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا نقدان نہیں ہؤا۔ کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں میرا خیال ہے۔ کم از کم اِس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں

انگریزی پوشش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا۔ راجہ صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں۔ ذرا موقعہ و محل دیکھ کر باتیں کرو۔ اور بولے انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا۔ شاعری میں تو اِس کا جواب نہیں ہے۔

انگریزی پوش۔ ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں۔ کہ شاعری کے معنے کیا ہیں۔ وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا مُنتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ میرا خیال ہے۔ آپ نے ہندوستانی شعرا کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ اگر دیکھا ہے۔ تو سمجھا نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے قمر کا مُنہ بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ بولے آپ مسٹر ہرا نچے ہیں آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں شایع ہوتے ہیں اور لوگ اُنہیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

اِس کے معنی یہ تھے۔ کہ اب آپ زیادہ نہ بہکئے۔ غریب قمر کو پہان چپے کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ ایک اور دیسی صاحب آئے۔ راجہ صاحب نے تپاک سے اُن کا بھی استقبال کیا۔ آئیے ڈاکٹر چڈہا۔ مزاج تو اچھے ہیں۔

چڈہا صاحب نے راجہ صاحب سے ہاتھ ملایا اور قمر کی طرف دیکھ کر بولے۔ آپ کی تعریف؟

راجہ صاحب نے قمر کا تعارف کرایا۔ آپ حضرت قمر اور شاعر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا۔ اچھا آپ شاعر ہیں۔ اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔

پھر ایک اور صاحب آئے۔ یہ شہر کے نامی بیرسٹر تھے۔ راجہ صاحب نے ان سے بھی قمر کا تعارف کرایا۔ اُنہوں نے بھی اسی انداز سے کہا۔ اچھا آپ شاعر ہیں! اور آگے بڑھ گئے۔

یہ تماشہ کئی مرتبہ ہؤا۔ اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی ''اچھا آپ شاعر ہیں۔

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے۔ اُن کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا۔ اُن کا عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا۔ تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو بکاؤ یہاں تمہارا کیا کام؟ تمہارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ۔ قمر اپنے اوپر جھنجلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے۔ لیکن یہاں آکر اُن کی جس قدر تذلیل ہوئی تھی۔ اُس کو دیکھ کر وہ اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا اُنہوں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی۔ تمہارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں۔ کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم اس خود غرض دنیا میں کسی کے کام نہیں آسکتے۔ وکیل بیرسٹر تمہارا احترام کیوں کریں تم اُن کے موکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمہاری طرف کیوں دیکھیں۔ انہیں بغیر فیس کے تمہارے گھر آنے کی ضرورت نہیں تم لکھنے کے لئے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ بس دنیا میں تمہارا اور کوئی مصرف نہیں ہے۔

یکایک لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا وہ آگئے۔ یہ صاحب یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔ راجہ صاحب نے لپک کر اُن سے ہاتھ ملایا اور آکر قمر سے بولے۔ آپ اپنی نظم تو لکھ ہی لائے ہونگے

قمر نے جواب دیا۔ میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی۔

"سچ! تب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا۔ ارے بھلے آدمی! اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو۔ دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقعہ پر ایک نظم کا پڑھانا لازمی ہے"

"میں اس قدر جلدی کوئی چیز نہیں لکھ سکتا"

"میں نے بے کار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا"

"بالکل بے کار"

"ارے بھائی جان! کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجئے۔ یہاں کون جانتا ہے"

"جی نہیں! معاف فرمائیے میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں"۔

یہ کہتے کہتے حضرت قمر وہاں سے چل دئے۔ گھر پہنچے۔ تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا "اتنی جلدی کیونکر چلے آئے"

"میری وہاں ضرورت نہ تھی"

"چہرہ کھلا ہوا ہے۔ خوب عزت افزائی ہوئی ہو گی"۔

"ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی"

"خوب خوش ہو رہے ہو"

"اس لئے کہ آج مجھے ہمیشہ کے لئے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں۔ اور جلنے کے لئے بنا ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لئے جنت ہے۔ میں نے آج یہ سمجھ لیا۔ کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔

دو بیل

جانوروں میں گدھا سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ ہم جب کسی شخص کو پرلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں۔ تو اُسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بیوقوف ہے۔ یا اُس کی سادہ لوحی اور انتہا درجہ کی قوتِ برداشت نے اُسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اُس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ گائے شریف جانور ہے۔ مگر سینگ مارتی ہے کتا بھی غریب جانور ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُسے بھی غصّہ آجاتا ہے۔ مگر گدھے کو کبھی غصّہ نہیں آتا۔ جتنا جی چاہے مارلو۔ چاہے جیسی خراب سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اُس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئینگے۔ اپریل میں شائد کبھی کلیل کرلیتا ہو۔ پر ہم نے تو اُسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سُکھ دُکھ نفع نقصان سے کبھی اُسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی مُنیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں۔ سب اُس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن آدمی اسے بیوقوف کہتا ہے۔ اعلیٰ خصلتوں کی ایسی

توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ ممکن ہے۔ اِس دنیا میں سیدھے پن کے لئے
جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے۔ جو اُس سے کچھ ہی کم گدھا ہے
اور وہ ہے بیل۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کچھ اُسی
سے ملتے جلتے معنوں میں بچھیا کے تاؤ کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے
بھی ہیں۔ جو بیل کو بیوقوفوں کا سردار کہنے کو طیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں
ہے۔ بیل کبھی کبھی مارتا بھی ہے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے
ہیں۔ اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا
ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے، ایک کا نام ہیرا تھا۔ دوسرے
کا موتی۔ دونوں پچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت۔ کام میں چوکس
ڈیل ڈول میں اونچے۔ بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت
سی ہو گئی تھی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبان
خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے
کے دل کی بات کیونکر سمجھ جاتے تھے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور اُن میں کوئی
نہ کوئی ناقابل فہم قوت تھی۔ جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی
انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا
اظہار کرتے تھے۔ کبھی کبھی دونوں سینگیں ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں۔
محض زندہ دلی سے۔ محض ہنسی مذاق سے۔ جیسے یار دوستوں میں بھی کبھی کبھی
دھول دھپّا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے
جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی

ہیں جوتے جاتے۔ اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے۔ تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی۔ کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے۔ تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اُتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسا پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اُٹھتے، ایک ساتھ ناند میں مُنہ ڈالتے، اور ایک ہی ساتھ بیٹھتے۔ ایک مُنہ ہٹا لیتا۔ تو دوسرا بھی ہٹا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لئے اپنے سسرال بھیجے بیلوں کو کیا معلوم۔ وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں۔ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا۔ کون جانے، بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں پسینہ آگیا۔ پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا، تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی۔ تو جھوری سے پوچھتے تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تو تمہاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا، تو اور کام لے لیتے، ہم کو انکار نہ تھا۔ ہمیں تمہاری خدمت میں مر جانا بھی قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا، سر جھکا کر کھا لیا پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا۔

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں جا پہنچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے اُنھوں نے اپنا گھر سمجھا تھا۔ وہ آج ان سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر، نیا گاؤں، نئے آدمی سب اُنہیں بیگانے سے لگتے تھے۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا۔ اور

لیٹ گئے۔ جب گاؤں میں سوتا پڑ گیا۔ تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑا لئے اور گھر کی طرف چلے۔ پگھے بہت مضبوط تھے۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ بیل انہیں توڑ سکینگے۔ پر ان دونوں میں اس وقت دُگنی طاقت آگئی تھی ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا۔ کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے۔ اور دونوں کی آنکھوں میں محبت کی ناراضگی جھلک رہی تھی جھوری اُن کو دیکھ کر محبت سے باولا ہو گیا اور دوڑ کر اُن کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہائت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے۔ اور تالیاں بجا بجا کر اُن کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا۔ مگر اہم ضرور تھا بال سبھا نے فیصلہ کیا۔ کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا، کوئی گُڑ۔ کوئی چوکر، کوئی بھوسی

ایک لڑکے نے کہا۔ ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہونگے۔

دوسرے نے تائید کی۔ اتنی دُور سے دونوں اکیلے چلے آئے۔

تیسرا بولا۔ پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہونگے۔

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا۔ ہاں بھائی ضرور ہوں گے۔

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا، تو جل اُٹھی۔ بولی۔ کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا۔ بھاگ کھڑے ہوئے جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا۔ بولا۔ نمکحرام کیوں ہیں

چارہ دانہ نہ دیا ہوگا۔ تو کیا کرتے۔

عورت نے تنک کر کہا۔ بس تمہیں بیلوں کو کھلانا جانتے ہو۔ اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں۔

جھوری نے چڑایا۔ چارہ ملتا۔ تو کیوں بھاگتے؟

عورت چڑی۔ بھاگے اس لئے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں تو تو ڑ کر جوتتے بھی ہیں۔ یہ دونوں ٹھیرے کام چور بھاگ نکلے۔ اب دیکھتی ہوں۔ کہاں سے کھلی اور چوکر ملتا ہے۔ خشک بھوسے کے سوائے کچھ نہ دونگی۔ کھائیں۔ چاہے مریں۔

وہی ہوا۔ مزدور کو کڑی تاکید کر دی گئی۔ کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسا دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا۔ تو پھیکا پھیکا۔ نہ چکناہٹ، نہ رس کیا کھائیں۔ پُر امید نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھنے لگے۔

جھوری نے مزدور سے کہا۔ تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے؟

مزدور۔ مالکن مجھے مار ہی ڈالیگی۔

جھوری۔ ڈال دے تھوڑی سی۔

مزدور۔ نہ دادا۔ بعد میں تم بھی انہیں کی سی کہو گے۔

(۳)

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا۔ اور بیلوں کو لے چلا۔ اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا۔ مگر ہیرا نے سنبھال لیا۔ اس میں قوت برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھا۔ اور

اور کل کی شرارت کا مزہ چکھایا۔ پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چونی سب کچھ دیا۔

ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی۔ اس پر خشک بھوسہ۔ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں نہ اٹھانے کی قسم کھالی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا۔ مگر انہوں نے پاؤں نہ اٹھایا۔ ایک مرتبہ جب اس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا۔ تو موتی غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ ہل لے کر بھاگا۔ ہل، رسی، جوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ہو گئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ہوتیں۔ تو وہ دونوں نکل گئے تھے۔

ہیرا نے زبان خاموش سے کہا۔ بھاگنا مشکل ہے۔

موتی نے بھی نگاہوں سے جواب دیا۔ تمہاری تو اس نے جان ہی لے لی تھی۔ اب کے بڑی مار پڑیگی۔

ہیرا۔ پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ہے، تو مار سے کہاں تک بچیں گے۔ گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آرہا ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں۔

موتی۔ کہو تو میں بھی دکھا دوں کچھ مزہ

ہیرا۔ نہیں بھائی۔ کھڑے ہو جاؤ۔

موتی۔ مجھے ماریگا، تو میں ایک آدھ کو گرا دوں گا۔

ہیرا۔ یہ ہمارا دھرم نہیں ہے۔

موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ گیا آپہنچا۔ اور دونوں کو پکڑ کر لے چلا۔

خیریت ہوئی۔ کہ اُس نے اس وقت مار پیٹ نہ کی۔ نہیں موتی بھی تیار تھا۔ اسکے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اور اس کے ساتھی سمجھ گئے۔ کہ اس وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے

آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بھوسہ لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے۔ اُسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لئے نکلی اور دونوں کے مُنہ میں دیکر چلی گئی۔ اُس ایک ایک روٹی سے اُن کی بھوک تو کیا مٹتی۔ مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا معلوم ہوُا۔ یہاں بھی کوئی صاحب دل ہے۔ لڑکی گیا کی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ سوتیلی ماں اُسے مارتی رہتی تھی۔ اس لئے ان بیلوں سے اسے ہمدردی ہو گئی۔

دونوں دن بھر جوتے جاتے۔ اُڑتے۔ ڈنڈے کھاتے۔ شام کو تھان پر باندھ دیئے جاتے۔ اور رات کو وہی لڑکی انہیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اِس کھانے کی یہ برکت تھی۔ کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے۔ مگر دونوں کی آنکھوں میں، نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا۔ اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا!

ہیرا۔ کیا کرنا چاہتے ہو؟

موتی۔ گیا کو سینگ پر اُٹھا کر پھینک دوں؟"

ہیرا۔ مگر وہ لڑکی اُسی کی بیٹی ہے۔ اُسے مار گراؤ گے، تو وہ یتیم ہو جائے گی۔

موتی۔ تو مالکن کو نہ پھینک دوں۔ وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔

ہیرا۔ عورت کو مارو گے۔ بڑے بہادر ہو۔

موتی۔ تم تو کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے۔ تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں۔

ہیرا- ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ایسی موٹی رسی ٹوٹے گی کیونکر۔
موتی- پہلے رسی کو چبا لو- پھر جھٹکا دے کر توڑ ڈالو- رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی- تو دونوں رسیاں چبانے لگے- پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی... بیچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے تھے۔

معاً گھر کا دروازہ کھلا- اور وہی لڑکی نکلی- دونو سر جھکا کر اس کا ہاتھ چاٹنے لگے- دونوں کی دُمیں کھڑی ہو گئیں- اس نے ان کی پیشانی سہلائی اور بولی- کھول دیتی ہوں- بھاگ جاؤ- نہیں یہ لوگ تمہیں مار ڈالینگے- آج گھر میں مشورہ ہو رہا ہے- کہ تمہاری ناک میں ناتھ ڈال دیئے جائیں- اس نے زور سے کھول دیئے- پر دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا- اب چلتے کیوں نہیں؟

ہیرا نے جواب دیا- اس غریب پر آفت آ جائیگی- سب اسی پر شبہ کریں گے یکایک لڑکی چلائی- او دادا! او دادا! دونوں پھوپھا والے بیل بھاگے جا رہے ہیں- دوڑو- دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں۔

گیا- گھبرا کر باہر نکلا- اور بیلوں کو پکڑنے چلا- بیل بھاگے- گیا نے پیچھا کیا وہ اور بھی تیز ہو گئے- گیا نے شور مچایا- پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لینے کے لئے لوٹا- دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقع مل گیا- سیدھے دوڑتے چلے گئے- یہاں تک کہ رستہ کا خیال نہ رہا- جس راہ سے یہاں آئے تھے اُس کا پتہ نہ تھا- نئے نئے گاؤں ملنے لگے- تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے- کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا- معلوم ہوتا ہے، رستہ بھول گئے۔
موتی- تم بھی بے تحاشا بھاگے- وہیں- اُسے مار گراتے۔

ہیرا۔ اُسے مار گراتے، تو دُنیا کیا کہتی۔ وہ اپنا دھرم چھوڑ دے، لیکن ہم، اپنا دھرم کیونکر چھوڑ دیں۔

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے۔ کھیت میں مٹر کھڑی تھی چرنے لگے۔ وہ رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ جب پیٹ بھر گیا۔ اور دونوں کو آزادی کا احساس ہؤا۔ تو اُچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکار لی پھر سینگ ملائے اور ایک دوسرے کو ڈھکیلنے لگے۔ موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا۔ تب اُسے بھی غصہ آیا۔ سنبھل کر اٹھا۔ اور پھر موتی سے لڑنے لگا۔ موتی نے دیکھا۔ کھیل میں جھگڑا ہوا چاہتا ہے۔ تو ایک طرف ہٹ گیا۔

(۴)

ارے یہ کیا! کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ہے۔ ہاں سانڈ ہی تو ہے۔ وہ سامنے آپہنچا۔ دونوں دوست تذبذب میں پڑ گئے۔ سانڈ پورا ہاتھی تھا۔ اُس سے لڑنا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی۔ انہیں کی طرف آرہا تھا۔ کتنا جسیم تھا۔

موتی نے کہا بُرے پھنسے۔ جان کیسے بچے گی۔ کوئی طریقہ سوچو۔

ہیرا نے کہا۔ غرور سے اندھا ہو رہا ہے۔ منت سماجت کبھی نہ سُنے گا۔

موتی بھاگ کیوں نہ چلیں

ہیرا بھاگنا پست ہمتی ہے۔

موتی۔ تو تم یہیں مرو۔ بندہ تو دو گیارہ ہوتا ہے۔

ہیرا۔ اور جو دوڑائے تو پھر ——"

موتی۔ کوئی طریقہ بتاؤ۔ لیکن ذرا جلدی۔ وہ تو آ پہنچا۔

ہیرا۔ طریقہ یہی ہے۔ کہ ہم دونو ایک ساتھ حملہ کر دیں۔ میں آگے سے دھکیلوں تم پیچھے سے دھکیلو۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہوگا۔ جوں ہی مجھ پر حملہ کرے تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہؤا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ہیرا پر جھپٹا، موتی نے پیچھے سے ہلہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا۔ تو ہیرا نے دھکیلنا شروع کر دیا۔ سانڈ چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے دونوں کو گرا لے۔ پر یہ بھی اُستاد تھے۔ اُسے یہ موقع ہی نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سانڈ جھلا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا۔ تو موتی نے بغل سے آ کر اُس کے پیٹ میں سینگ چبھو دئے۔ سانڈ غصہ سے پیچھے مڑا۔ تو ہیرا نے دوسرے پہلو پر سینگ رکھ دئے۔ بیچارہ زخمی ہو کر بھاگا۔ اور دونوں فتحیاب دوستوں نے دور تک اُس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب دونوں نے اُس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشہ میں جھومتے چلے جاتے تھے۔ موتی نے اپنی اشاروں کی زبان میں کہا۔ میرا جی تو چاہتا تھا۔ کہ بچہ جی کو مار ہی ڈالوں۔

ہیرا۔ گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے۔

موتی۔ یہ سب فضول ہے۔ اگر اس کا داؤ چلتا۔ تو کبھی نہ چھوڑتا۔

ہیرا۔ اب گھر کیسے پہنچینگے۔ یہ سوچو۔

موتی۔ پہلے کچھ کھا لیں، تو سوچیں۔ ابھی تو عقل کام نہیں کرتی۔

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا۔ ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا۔ لیکن اُس نے ایک نہ سنی۔ ابھی دو ہی چار منہ مارے تھے۔ کہ دو آدمی لاٹھیاں لئے آ گئے۔

اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ہیرا تو مینڈ پر تھا نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا۔ اُسکے سُم کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ نہ بھاگ سکا۔ پکڑا گیا۔ ہیرا نے دیکھا۔ دوست تکلیف میں ہے۔ تو لوٹ پڑا۔ پھنسینگے، تو اکٹھے پھنسینگے۔ رکھوالوں نے اُسے بھی پکڑ لیا۔

دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں بند تھے۔

(۵)

اُن کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، کہ سارا دن گذر گیا۔ اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ یہ کیسا مالک ہے۔ اِس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں۔ کئی بکریاں۔ کئی گھوڑے، کئی گدھے، مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے۔ کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارے دن دونوں دوست دروازہ کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر کوئی چارا لیکر نہ آیا۔ تب غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی۔ مگر اِس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔

رات کو بھی جب کھانا نہ ملا، تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔ موتی سے بولا۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے۔ جان نکل رہی ہے۔

موتی۔ اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی! یہاں سے بھاگنے کا کوئی طریقہ سوچو

ہیرا۔ آؤ دیوار توڑ ڈالیں۔

موتی۔ مجھسے تو اب کچھ نہ ہوگا۔

ہیرا۔ بس۔ اسی بوتے پر اکڑتے تھے۔

موتی۔ ساری اکڑ نکل گئی بھائی!

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دئے۔ اور زور مارا تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا۔ اِس سے اُس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اُس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ ہر ٹکر میں تھوڑی تھوڑی سی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہوس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آ نکلا۔ ہیرا کی یہ وحشت دیکھ کر اُس نے اُسے کئی ڈنڈے رسید کئے۔ اور موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔ موتی نے پڑے پڑے اسکی طرف دیکھا۔ گویا زبانِ حال سے کہا۔ آخر مار کھائی۔ کیا ملا؟

ہیرا۔ زور تو آزما لیا

موتی۔ ایسا زور مارنا کس کام کا۔ اور بندھن میں پڑ گئے۔

ہیرا۔ اس سے باز نہ آؤنگا۔ خواہ بندھن بڑھتے جائیں۔

موتی۔ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

ہیرا۔ اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ یوں بھی تو مرنا ہی ہے۔ ذرا سوچو۔ اگر دیوار گر جاتی۔ تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں۔ کسی کے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ دو چار دن اور یہی حال رہا۔ تو سب مر جائینگے۔

موتی۔ ہاں یہ بات ہے تو لو پھر میں بھی زور لگاتا ہوں۔

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا۔ تھوڑی سی مٹی گری۔ اور ہمت بڑھی۔ تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اس طرح زور کرنے لگا۔ جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔ آخر کوئی دو گھنٹہ کی قوت آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصّہ گر گیا۔ اُس نے دگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا۔ تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا۔ کہ نیم جان جانور اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ

نکلیں۔ بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اِس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں۔ پر گدھے ابھی وہیں کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا تم کیوں نہیں بھاگ جاتے؟

ایک گدھے نے کہا کہیں پھر پکڑ لئے جائیں، تو

ہیرا۔ پکڑ لئے جاؤ، تو اُس وقت دیکھا جائیگا۔ اس وقت تو موقع ہے۔

گدھا۔ ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہم نہ بھاگیں گے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے، بھاگیں یا نہ بھاگیں۔ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا۔ تم جاؤ۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا۔ تم مجھے اتنا خود غرض سمجھتے ہو۔ ہیرا! ہم اور تم اتنے دنوں ساتھ رہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں!

ہیرا۔ بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائینگے۔ یہ تمہاری ہی شرارت ہے۔

موتی۔ جس قصور کے لئے تمہارے گلے میں رسا پڑا ہے اُس کے لئے اگر مجھ پر مار پڑے۔ تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا۔ کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ، مار مار کر باہر نکال دیا۔ اور اپنے دوست کے پاس آکر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی۔ اور اُسے بھی موٹی رسی سے باندھ دیا گیا۔

(٦)

ایک ہفتہ تک دونوں بیل وہاں بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اُس

کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے۔ کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا۔ یہی اُن کی خوراک تھی۔ دونوں اتنے کمزور ہو گئے۔ کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈُگی بجنے لگی۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دونوں بیل نکالے گئے۔ اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ لوگ آکر اُن کی صورت دیکھتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایسے نیم جاں بیلوں کو کون خریدتا؟

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرے پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے۔ آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اُس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اُٹھے۔ وہ کون ہے اور انہیں کیوں خریدتا ہے۔ اس کے متعلق اُنہیں کوئی شبہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

ہیرا نے کہا۔ گیا کے گھر سے ناحق بھاگے۔ اب جان نہ بچے گی۔

موتی نے جواب دیا۔ کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا۔

ہیرا۔ بھگوان کے لئے ہمارا مرنا جینا دونوں برابر ہے۔

"چلو اچھا ہے۔ کچھ دن اُن کے پاس رہینگے"۔

"ایک مرتبہ بھگوان نے اُس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائینگے"

موتی۔ یہ آدمی چھری چلائے گا۔ دیکھ لینا۔

ہیرا۔ معمولی بات ہے۔ مگر ان دکھوں سے چھوٹ جائینگے۔

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اُس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں

کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بیچارے پاؤں تک نہ اُٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اچھلتا تھا۔ کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پُر مسرت زندگی تھی۔ اِن کی لیکن کیسے خود غرض تھے۔ کسی کو اُن کی پرواہ نہ تھی۔ کسی کو خیال نہ تھا۔ کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً انہیں ایسا معلوم ہوا۔ کہ یہ رستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا۔ اُن کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہی کھیت ہیں، وہی باغ ہیں وہی گاؤں۔ اب اُن کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ساری تھکان۔ ساری کمزوری۔ ساری مایوسی رفع ہو گئی۔ ارے یہ تو اپنا کھیت آ گیا۔ یہ اپنا کنواں ہے۔ جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا ہمارا گھر نزدیک آ گیا۔

ہیرا بولا۔ بھگوان کی مہربانی ہے۔

موتی۔ میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔

ہیرا یہ جانے بھی دیگا۔ اتنا سوچ لو۔

موتی۔ اِسے میں مار گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے تب تک ہم گھر جا پہنچینگے

ہیرا۔ نہیں دوڑ کر تھاں تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلینگے۔

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھاں پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا۔ اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری

کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ دوسرا اُس کا پیر۔

اُس آدمی نے آکر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔ جھوری نے کہا۔ یہ بیل میرے ہیں۔ ”تمہارے کیسے ہیں۔ میں نے نیلام میں لیا ہے۔

جھوری۔ میرا خیال ہے۔ چرا کر لائے ہو۔ چپکے سے چلے جاؤ۔ میرے بیل ہیں۔ میں بیچوں گا۔ تو بکیں گے۔ کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق حاصل ہے

”میں نے تو خریدے ہیں“۔

”خریدے ہوں گے،،

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لئے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا۔ اور اسے کھدیڑتا ہوا گاؤں کے باہر تک لے گیا۔ اور تب اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا۔ پتھر پھینکتا تھا۔ اور موتی اُس کا رستہ روکے ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔ اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا۔ تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا۔ میں ڈر رہا تھا۔ کہ کہیں تم اُسے مار نہ بیٹھو۔

موتی۔ اگر نزدیک آتا، تو ضرور مارتا۔

ہیرا۔ اب نہ آئیگا۔

موتی۔ آئے گا۔ تو دُور ہی سے خبر لونگا۔ دیکھوں کیسے لے جاتا ہے؟

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسہ، چوکر دانا سب کچھ بھر دیا گیا۔ دونو بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا اُن کی طرف دیکھتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا۔ بیسیوں لڑکے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اُسی وقت مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لئے۔

طلوعِ مُحبّت

(۱)

بھوندو پسینہ میں شرابور لکڑی کا ایک گٹھا سر پہ لئے آیا۔ اور اُسے زمین پر پٹک کر بنٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبانِ حال سے پوچھ رہا تھا۔ کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہُؤا۔

شام ہو گئی تھی۔ پھر بھی لو چلتی تھی۔ اور آسمان پہ گرد و غبار چھایا ہُوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی۔ بھوندو صبح گھر سے نکلا تھا، دوپہری اُس نے ایک درخت کے سایۂ تلے بسر کی تھی۔ سمجھا تھا۔ اِن تپسیا سے دیوی جی کا منہ سیدھا ہو گیا ہو گا۔ لیکن آ کر دیکھا۔ تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

بھوندو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا۔ لا ایک لوٹا پانی دیدے بڑی پیاس لگی ہے۔ مر گیا سارے دن۔ بجار میں جاؤں گا، تو تین آنے سے بیسی نہ ملینگے۔

بنٹی نے سرکی کے اندر میٹھے بیٹھے کہا۔ دھرم بھی لوٹو گے اور پیسے بھی۔

مُنہ دھو رکھو۔

بھوندو نے بھویں سکوڑ کر جواب دیا۔ کیا دھرم دھرم بکتی ہے۔ دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ دھرم وہ کرتا ہے۔ جس پر بھگوان کی مہربانگی ہو، ہم دھرم کھاک کرینگے۔ پیٹ بھرنے کو چنا چبینا تو ملتا نہیں۔ دھرم کرینگے۔

نبٹی نے اپنا وار اوچھا پڑتے دیکھ کر چوٹ پر چوٹ کی۔ دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں۔ جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھر سکیں۔ مگر پڑوسیوں کی دعوت کرتے پھرتے ہیں۔ ورنہ سارے دن بن بن کی لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دھرم کا چھکڑا کیا اکیلے نہیں چلتا۔

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اُٹھا۔ اُس کی رگیں تن گئیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے نبٹی کا مُنہ وہ ایک ڈپٹ میں بند کر سکتا تھا۔ مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا۔ جس کی طاقت کی سارے کنجڑوں پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جو تن تنہا سو پچاس جوانوں کا نشہ اُتار سکتا تھا وہ ایک کمزور عورت کے سامنے مُنہ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا جورو دھرم گنوانے کے لئے نہیں لائی جاتی۔ دھرم کمانے کے لئے لائی جاتی ہے

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اُترے ہُوئے تھے۔ سارے باغ میں سرکیاں ہی سرکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اُن تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے اندر ایک گھرانا زندگی کی تمام مصروفیتوں، تمام بے نوایوں کے ساتھ گذر اوقات کر رہا تھا۔ ایک طرف چکی تھی۔ ایک طرف باورچی خانہ کی اشیاء۔ ایک طرف اناج کے مٹکے دروازہ پر ایک کھٹولی بچوں کے لئے پڑی تھی۔ ہر ایک گھر کے ساتھ دو دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرہ کوچ ہوتا تھا۔ تو سارا ساز و سامان ان گدھوں پر لاد دیا

جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی زندگی تھی۔ ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی۔ ایک ساتھ ٹھہرتی تھی۔ اُن کی دُنیا اسی بستی کے اندر تھی۔ آپس ہی میں شادی بیاہ۔ لین دین جھگڑے قضیئے ہوتے رہتے تھے۔ اِس دُنیا کے باہر، سارا جہان اُن کے لئے شکارگاہ تھا۔ اُن کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آکر انہیں نگرانی میں لے لیتی تھی۔ پڑاؤ کے اِردگرد چوکیداروں کا پہرہ لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے، تو پولیس کے آدمی اُن کے ساتھ ہو لیتے۔ رات کو اُن کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی گرد و نواح کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھا لیتے اور اُن کے ہاتھ میں جا کر کوئی شے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے۔ چوکیدار اُن سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ خونخوار تھے۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ سختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے ہیں۔ ساری بستی میں بھوندو ہی اک ایسا شخص تھا۔ جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لئے نہیں۔ کہ وہ پولیس والوں سے خائف تھا۔ بلکہ اِس لئے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی۔ کہ وہ ناجائز طریقہ سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

نبٹو کو شوہر کی یہ پاکدامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اُس کی اور بہنیں نئی نئی پھڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں تو نبٹو اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے۔ لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو طیار نہ ہوتا تھا۔ آج بھی صبح ہی سوال درپیش تھا۔ اور بھوندو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا تھا۔ کچھ مل جاتا۔ تو نبٹو کی اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر آج سوائے لکڑی کے اور کوئی شے نہ ملی۔ نہ کوئی جانور نہ خس

نہ چھڑی ہوتی۔

نبٹی نے کہا۔ جن سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہی دھرماتما بن جاتے ہیں۔ لنڈا اپنے مانڈھی میں خوش ہے۔

بھوندو نے پوچھا۔ تو میں نکھٹو ہوں۔

نبٹی نے اِس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا۔ میں کیا جانوں۔ تم کیا ہو۔ میں تو یہ جانتی ہوں۔ کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں۔ سب کھاتی ہیں۔ ہنستی کھیلتی ہیں۔ پہنتی اوڑھتی ہیں۔ کیا میرے ہی دل نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ بیاہ کرکے جندگی کھراب ہو گئی۔

بھوندو نے ایک لمحہ سوچکر کہا۔ جانتی ہے۔ پکڑا گیا۔ تو تین سال سے کم کی سجا نہ ہو گی۔

نبٹی پر اثر نہ ہوا۔ بولی۔ جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے۔ تو تم ہی کیوں پکڑے جاؤ گے؟

بھوندو۔ اور لوگ پولیس کی کھوشامدیں کرتے ہیں۔ چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو چاہتی ہے۔ میں بھی یہ کرم کروں۔

نبٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی میں تمہارے ساتھ ستی ہونے نہیں آئی پھر تمہارے چھرے گنڈاسے کوئی کہاں تک ڈرے۔ جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا۔ تو رسا تڑا کر کسی کھیت میں جا گھستا ہے۔ میں تو آدمی ہوں۔

بھوندو نے اُس کا جواب نہ دیا۔ اُس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کر لے گی یہ خیال بھی اُس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ آج نبٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی دی۔ اب تک بھوندو اِس طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اُس کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دیگا۔

وہ اس کے لئے سب کچھ کر گذر یگا۔ آج بھوندو کی نگاہوں میں نبٹی کی وہ عزت نہیں رہی۔ وہ اعتماد نہیں رہا۔ مضبوط دیوار کو ٹکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی جب دیوار ہلنے لگتی ہے۔ تو ہمیں اس کے سنبھلنے کی فکر ہوتی ہے۔ آج بھوندو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ آج تک نبٹی اس کی اپنی تھی۔ وہ جس قدر اپنی طرف سے بے پروا تھا۔ اسی قدر اس کی طرف سے بے فکر۔ وہ جس طرح خود رہتا تھا۔ اسی طرح اس کو رکھتا تھا۔ جو خود کھاتا تھا۔ وہی اسے کھلاتا تھا۔ اسے اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ پر آج اسے معلوم ہوا۔ کہ وہ اس کی اپنی نہیں ہے۔ اب اسے اس کی خاص طور پر دلجوئی کرنا ہوگی۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آ رہا ہے۔ بھوندو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ کیونکہ گدھا کبھی کسی دوسرے گھر چلے جانے کی دھمکی نہ دیتا تھا۔ آج بھوندو نے باہر آ کر اسے پچکارا۔ اسکی پیٹھ سہلائی۔ اور اسے پانی پلانے کے لئے ڈول اور رسی لے کر کنوئیں پر چلا گیا۔

(۲)

اس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہو گئی۔ اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ نبٹی نے چوکیدار سے کہا۔ کل جنگل سے نہیں لوٹا۔ صبح کے وقت بھوندو آ پہنچا۔ اس کی کمر میں روپوں کی ایک تھیلی تھی۔ کچھ سونے کے گہنے تھے۔ نبٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دئے روپوں کی کیا پہچان ہو سکتی تھی۔

بھوندو نے پوچھا۔ اگر کوئی پوچھے۔ اتنے سارے روپے کہاں سے ملے

تو کیا کہو گی ؟

نبٹی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ کہدوں گی۔ کیوں بتاؤں۔ دنیا کماتی ہے۔ تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ ہم اپنا حساب کیوں دیں۔

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا۔ یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا نبٹی! تو کہہ دینا میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے ماہوار بچاتی رہی ہوں۔ ہمارا کھرچ ہی کون بڑا لمبا ہے۔

دونوں نے مل کر کئی جواب سوچ لئے۔ جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں۔ ایک ایک جڑی کے لئے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔ کھس، گھاس۔ جانوروں کی کھالیں سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے۔ نبٹی نے اپنے لئے کئی قسم کے کپڑے، چوڑیاں۔ بندے۔ سیندور۔ پان۔ تمباکو، تیل اور مٹھائی لی پھر دونوں شراب کی دکان پر گئے۔ خوب شراب پی۔ اور دو بوتلیں رات کے لئے لے کر گھومتے پھرتے، گاتے بجاتے گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے۔ نبٹی کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی اور کھانا پکانے لگی۔ تو پڑوسنوں نے تنقید کرنی شروع کر دی، "کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے"۔

"بڑا ادھر ماتما بنا پھرتا ہے"۔

"بگلا بھگت ہے"۔

"نبٹی تو جیسے آج ہواہیں اُڑ رہی ہے"۔

"آج بھوندا کی کھاتر ہو رہی ہے۔ ورنہ کبھی ایک لبا پانی دینے

بھی نہ اُٹھتی تھی۔"

اُس رات بھوندو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اُس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کسی قدر مشکل تھا۔ کچھ خودداری بھی کھونی پڑتی تھی دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائیگی۔ ہاں اُس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی اِس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی کام کرنے سے پہلے قربانی کرتے تھے۔ بھوندو نے یہ خطرہ نہ لیا۔ جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے۔ اُس میں سے دیوتاؤں کو کھلا دینا حماقت نہیں۔ تو اور کیا ہے۔ لوگوں سے اپنی چوری پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اِس لیئے اُس نے کسی کو خبر نہ دی۔ یہاں تک کہ نبٹی سے بھی نہ کہا۔ اور بکرے کی تلاش میں گھر سے باہر نکلا۔

نبٹی نے پوچھا۔ اب کھانے کی بکھت کہاں چلے؟

"ابھی آتا ہوں"۔

"مت جاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے"۔

بھوندو نے محبت کے اِس نئے اظہار پر خوش ہو کر کہا مجھے دیر نہ لگیگی۔ تو یہ گنڈا سا اپنے پاس رکھ لے۔

اُس نے گنڈا سا نکال کر نبٹی کے پاس رکھ دیا۔ اور باہر نکلا۔ مگر بکرا کہاں ملے۔ آخر اس مشکل کو بھی اُس نے اک خاص طریقہ سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈریے کے پاس کئی بکرے تھے۔ اُس نے سوچا کہ وہیں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں۔ دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے۔ یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا اور کیوں کر آیا۔؟

لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی تھا۔ کہ پولیس کے چار آدمیوں نے اُسے گرفتار کر لیا اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

(۳۱)

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اُسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھلی جاتی تھی۔ آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اُس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا۔ اُس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اُس میں اب مُنہ دکھائی بھی نہ دیتا تھا۔ آج وہ نیا آئینہ لائی تھی۔ اُس کے سامنے بیٹھ کر اُس نے بال سنوارے مُنہ پر اُبٹن ملا۔ صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگانے ہی سے تو اتنے گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا۔ تو اُس کا رنگ بھی کچھ نکھر آتا۔ ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہو جاتی۔ لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا۔ کل وہ صابن کی ٹکیاں ضرور خرید لائیگی۔ اور روز اِس سے مُنہ دھوئیگی۔ بال سنوار کر اُس نے ماتھے پر اَلسی کا لعاب لگایا۔ کہ بال اِدھر اُدھر منتشر نہ ہو جائیں۔ پھر پان لگائے چونا زیادہ ہو گیا تھا۔ اِس لئے مُنہ میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن اُس نے سمجھا۔ شائد پان کھانے کا یہی مزہ ہے۔ آخر کڑوی مرچ بھی تو لوگ مزے لے لے کر کھاتے ہی ہیں۔ گلابی رنگ کی ساڑھی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر اُس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ تو اُس کے آبنوسی رنگ پر سرخی دوڑ گئی اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی۔ افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہو جاتی ہے۔ نسائیت کی حیا کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھلائے۔

اِس طرح بناؤ سنگار کر کے بنٹی بھوندو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہو گئی اور وہ نہ آیا تو اس پر جھنجھلا اٹھی۔ روز تو سانجھ سے دروازے پر پڑے رہتے تھے۔ آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے ہیں۔ بنٹی کے سوکھے دل میں آج

پانی پڑتے ہی اسکی نسائیت اُگ آئی تھی۔ خفگی کیساتھ اُسے فکر بھی ہو رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر کئی مرتبہ پکارا۔ اسکی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اسے کئی مرتبہ شبہہ ہوا کہ بھوندو آ رہا ہے۔ وہ ہر مرتبہ سرکی کے اندر دوڑ آئی۔ اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کہ کچھ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھڑکن، ایسی الجھن اُسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی

بنٹی شوہر کے انتظار میں ساری رات بیقرار رہی۔ جوں جوں رات گذرتی جاتی تھی۔ اس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے۔ آج ہی اس کی پر لطف زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ آج ہی یہ حال

صبح جب وہ اٹھی۔ تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ اُس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ سی نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔

معاً کسی نے آکر کہا۔ اری بنٹی رات بھوندو پکڑا گیا۔

(۴)

بنٹی تھانے پہنچی۔ تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی۔ اور دم پھول رہا تھا۔ اُسے بھوندو پر رحم نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا۔ سارا زمانہ یہی کام کرتا ہے۔ اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ انہوں نے کہنے سننے پر ہاتھ بھی لگایا۔ تو چوک گئے۔ شوہر نہ تھا۔ تو صاف کہہ دینے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی۔ کہ آگ میں کود پڑو۔

اسے دیکھتے ہی تھانیدار نے دھونس جمائی۔ یہی تو ہے بھوندو کی عورت اسے بھی پکڑ لو۔

بنٹی نے اکڑ کر کہا۔ ہاں ہاں پکڑ لو۔ یہاں کسی سے نہیں ڈرتے۔ جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے۔ تو ڈریں کیوں؟

افسر اور ماتحت سب نبٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کا دل بھوندو کیطرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ اب اُسے سائے میں لے آئے۔ اُس نے ایک مرتبہ نبٹی کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا۔ دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آجانا۔

تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا۔ ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔ جیسے پاکیزگی کی دیوی ہی تو ہے۔ مگر اس پھیر میں نہ رہنا۔ میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لئے بھجواؤں گا۔ تین سال کے لئے۔ صاف صاف کہدو۔ اور سارا مال لوٹا دو۔ اسی میں خیریت ہے۔

بھونڈو نے میٹھے میٹھے کہا۔ کیا کہدوں۔ جو لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ اُن سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ اُن کا گلا کاٹنے کو بھی طیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے۔ کہ ہمارے پاس کسی کو دینے دلانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔

تھانیدار نے سخت لہجہ میں کہا۔ ہاں ہاں! سکھا پڑھا دے۔ بیوی کو، کہ کہیں کچھ بھید نہ کھول دے۔ لیکن ان گیدڑ بھبکیوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو نے اقبال نہ کر لیا۔ تو تین سال کے لئے جائیگا۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ ارے چھوٹے سنگھ اسے پکڑ کر کوٹھڑی میں بند کر دے۔

بھوندو نے بے پروائی سے کہا۔ داروگا ساب! بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو مگر کچھ ہاتھ نہ لگیگا۔ آپ کی دھمکیوں کے سامنے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ مگر میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا۔ کہ اس فولاد کو جھکانا دشوار ہے۔ بھوندو کے بشرہ سے شہیدوں کا سا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانیدار کا حکم پاتے ہی

دو آدمیوں نے بھوندو کو پکڑ کر کمرہ میں بند کر دیا۔ شوہر کی یہ بے بسی دیکھ کر ننٹی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو۔ خدا جانے کتنی سزا ہو جائے ممکن ہے۔ تین ہی سال کے لئے چلا جائے۔ جان پر کھیل کر بولی۔ دارو گا جی! تم سمجھتے ہو گے۔ ان گریبوں کی پیٹھ پر کوئی نہیں ہے۔ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بھلا چاہو۔ تو ان کو چھوڑ دو۔ کید ہو گئے تو میں کہیں کی نہ رہونگی۔

تھانیدار نے مسکرا کر کہا۔ تجھے کیا۔ یہ مر جائیگا۔ کسی اور سے بیاہ کر لینا۔ جو کچھ چوری کر کے لایا ہو گا۔ وہ تو تیرے ہی پاس ہوگا۔ کیوں نہیں اقبال کر کے چھڑا لیتی میں وعدہ کرتا ہوں، مقدمہ نہ چلاؤنگا۔ سب مال لوٹا دے۔ تو نے ہی منع دیا ہوگا۔ گلابی ساڑھی اور پان اور خوشبودار تیل کے لئے تو ہی بیقرار ہو رہی ہوگی اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ اور تو سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے۔ عجیب عورت ہے

ننٹی نے چند لمحے غور کیا۔ اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی! اچھا دارو گا ساب! میں سب کچھ دیدوں گی۔ ان پر حرف نہ آنے پائے۔

(۵)

بھوندو کو باہر نکالا گیا۔ تو اس نے خائف ہو کر پوچھا۔ کیوں کیا بات ہے

ایک چوکیدار نے کہا تیری عورت نے اقبال کر لیا۔

بھوندو پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ گلے کی آواز بند سی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بات سنتے ہی وہ جیسے بیدار ہو گیا۔ اس نے دونوں مٹھیاں کس لیں اور بولا۔ کیا کہا،،

کیا کہا۔ چوری کھل گئی۔ داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں رات

ہی اقبال کر لیتے۔ تو یہ نوبت کاہے کو آتی۔

بھوندو نے گرج کر کہا۔ وہ جھوٹ بولتی ہے"

وہاں مال بھی برآمد ہو گیا۔ تم ابھی تک اپنی ہی گا رہے ہو۔

اپنے آباؤ اجداد کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھوندو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلت کے بعد اب اُسے اپنی زندگی میں رُسوائی اور نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اب وہ اپنی برادری میں کسی کو مُنہ نہ دکھلا سکے گا۔

یکایک بنٹی آکر سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ کہ بھوندو کی خونخوار شکل دیکھ کر اُسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھوندو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی مانند تڑپ اُٹھا۔ اُس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا۔ اُن آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی۔ بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی اور اُلٹے پاؤں وہاں سے بھاگی۔

کسی دیوتا کے آہنی ہتھیاروں کے مانند وہ دو نو انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چُبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹی نے سوچا۔ اب کہاں جاؤں۔؟ بھوندو اُس کے ساتھ ہوتا۔ تو وہ پڑوسیوں کے طعنے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن اب وہ اکیلی تھی اُس کے لئے گھر جانا ناممکن تھا۔ اور وہ بھوندو کی وہ دو نو انگارے کی سی آنکھیں اُس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی چیزوں کا پیار اُسے ڈیرہ کی طرف کھینچنے لگا۔ شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلوڑیاں چھانکے پسانڈی میں پڑی تھیں۔ وہ تشنہ آرزوئیں جو موت کو سامنے دیکھ کر بھی دُنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی ہیں۔ اُسے کھینچ کر ڈیرہ کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پڑاؤ پر پہنچی۔ تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینیٔ حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی۔ اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا۔ سب نے سمجھ لیا بھوندو اب ہمارا آدمی نہیں صرف اس کی سرکی اس ویرانے میں گویا روتی ہوئی کھڑی تھی۔ ننٹی نے اس کے اندر پاؤں رکھا۔ تو اس کے دل کی وہی حالت ہوئی۔ جو خالی گھر دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے۔ کون کون سی چیز اٹھائے۔! اس جھونپڑی میں اس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے۔ لیکن آج اس سے اسے وہ محبت پیدا ہو گئی تھی۔ جو کسی ماں کے دل میں اپنے نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیاء ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ اس نے انہیں اٹھا کر ان کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھلوڑیوں کی ہانڈی کچھ ہل گئی تھی۔ ننٹی کو شبہ ہوا۔ کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو۔ اس نے جلدی سے ہانڈی اتار کر دیکھا۔ پھلوڑیاں کسی نے نہ چھیڑی تھیں۔ پانوں پر جو گیلا کپڑا لپٹا تھا۔ وہ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا.......

بھوندو آرہا ہے۔ اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں! ننٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھوندو کے غصہ کا اسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دل کو مضبوط کیا۔ کیوں مارے گا۔ کچھ سنے گا۔ کچھ سوال جواب کریگا۔ یوں ہی گنڈاسا چلا دیگا۔ اس نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اسے آفت سے بچایا ہے۔ مرجاد جان سے پیاری نہیں ہوتی۔ بھوندو کو ہوگی۔ اسے نہیں ہے۔ کیا اتنی سی بات پر وہ اس کی جان لے لیگا۔

اس نے سرکی کے دروازہ سے جھانک کر دیکھا بھوندو نہ تھا۔ اس کا گدھا

آرہا تھا۔ بنٹی آج اُس بدبخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی۔ جیسے اپنا بھائی میکے سے بتاسوں کی پوٹلی لئے تھکا ماندہ چلا آرہا ہو۔ اُس نے جاکر اس کی گردن سہلائی۔ اور اس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا۔ وہ اُسے پھوٹی آنکھوں نہ بھاتا تھا۔ پر آج اسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ وہ پھر کانپ اٹھی۔

اُس نے پھر سوچا۔ کیا کسی طرح نہ چھوڑیگا۔ وہ روتی ہوئی اس کے پیروں پر گر پڑیگی۔ کیا تب بھی نہ چھوڑیگا۔ ان آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا کرتا تھا۔ کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اسے رحم نہ آئے گا۔ بنٹی نے مٹی کے کچڑ میں شراب انڈیل کر پی اور پھلوڑیاں کھائیں۔ جب اُسے مرنا ہی ہے۔ تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اُس کے سامنے تھیں اُس نے دوسرا کچڑ بھرا اور وہ بھی پی گئی۔ زہر بلا ٹھرّا۔ جسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ کو کھولانے لگا۔ بوتل آدھی رہ گئی تھی۔

اُس نے سوچا۔ بھوندو پوچھے گا۔ تو نے اتنی دارو کیوں پی۔ تو وہ کیا کہیگی۔ کہدیگی۔ ہاں پی۔ کیوں نہ پئے۔ اسی کے لئے تو یہ سب کچھ ہؤا۔ وہ ایک بوند بھی نہ چھوڑے گی۔ جو ہونا ہے ہو جائے۔ بھوندو اُسے مار نہ سکیگا۔ وہ اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے۔ اُس نے پھر کچڑ بھرا اور پی گئی۔ پانچ برس کی گذری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ سینکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوئی تھیں۔ آج بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہو رہی تھی۔ بیچارہ جو کچھ کماتا ہے اسی کے ہاتھوں پر رکھ دیتا ہے۔ اپنے لئے ایک پیسہ کا تمبا کو بھی لیتا ہے تو پیسہ اسی سے مانگتا ہے۔ صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے۔ جو کام اس

اس سے نہیں ہوتا۔ اُسے کیوں کر کرے۔

معاً ایک کانسٹبل نے آکر کہا۔ اری بنٹی کہاں ہے۔ چل دیکھ بھوندو کا حال بے حال ہو رہا ہے۔ ابھی تک تو چپ چاپ بیٹھا تھا۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آیا۔ کہ ایک پتھر پر سر ٹپک دیا۔ مار لہو بہ رہا ہے۔ ہم لوگ دوڑ کر مکڑ نہ لیں تو جان ہی دے دی تھی۔

(۶)

ایک ہفتہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں موسلا دھار برکھا ہو رہی تھی۔ بھوندو کی سرکی اب بھی اُس ویرانے میں کھڑی تھی۔ بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اور جسم مرجھا گیا تھا۔ وہ فکرمندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے۔ چاہتا ہے۔ اُٹھ کر باہر دیکھوں۔ مگر اُٹھا نہیں جاتا۔

بنٹی سر پر گھاس کی ایک گٹھڑی لئے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی۔ وہی گلابی ساڑھی ہے پر تار تار۔ لیکن اُس کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ رنج و افسوس کی جگہ اُس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے۔ چال ایسی مستانہ ہے آنکھیں ایسی چمکتی ہیں۔ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ بھوندو نے آہستہ سے کہا۔ تو اتنی بھیگ رہی ہے۔ کہیں بیمار پڑ گئی۔ تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا۔ میں کہتا ہوں۔ تو اتنا کیوں مرتی ہے۔ دو گٹھے تو بیچ چکی تھی۔ اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے؟

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ کیسی ہانڈی؟

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اُٹھا۔ آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھول

اور اُس کے اندر نظر ڈال کر بولا۔ ابھی لوٹا۔ نہیں ہانڈی پھوڑ دوں گا۔

نبٹی نے دھوتی پنچوڑتے ہوئے کہا۔ ذرا آئینہ میں صورت دیکھو۔ گھی دودھ کچھ نہ ملے گا۔ تو کیسے اُٹھو گے۔ یا ہمیشہ چارپائی پر ہی پڑے رہنے کا ارادہ ہے۔

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا۔ اپنے لئے تو ایک ساڑھی بھی نہیں لائی۔ میرے لئے گھی اور دودھ سب چاہیئے۔ میں گھی نہ کھاؤنگا۔

نبٹی نے مسکرا کر کہا۔ اسی لئے تو گھی کھلاتی ہوں۔ کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگے اور میرے لئے ساڑھی لاؤ۔

بھوندو بولا۔ تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں کیوں؟

نبٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا۔ پہلے میرا گلا کاٹ دینا پھر جانا۔

شکار

پھٹے پرانے کپڑوں والی منیا نے رانی وسودھا کے چاند سے مکھڑے کی طرف دیکھا، اور راجکمار کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔ ہم غریبوں کا اس طرح کیسے گذارہ ہو سکتا ہے۔ مہارانی! میری تو اپنے آدمی سے ایک دن نہ پٹے۔ میں اُسے گھر میں نہ گھسنے دوں۔ ایسی کھری کھری سناؤں کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے

رانی وسودھا نے سنجیدگی سے مسکرا کر کہا۔ کیوں وہ کہیگا۔ تو میری باتوں میں بولنے والی کون ہے۔ میں جو چاہوں، کروں۔ تو اپنا روٹی کپڑا لیتی جا۔ تجھے میری دوسری باتوں سے کیا غرض۔ میں تیرا غلام نہیں ہوں۔

منیا تین ہی دن ہوئے۔ یہاں لڑکوں کو کھلانے کے لئے نوکر ہوئی تھی۔ اس سے قبل دو چار بھلے گھروں میں کھانا پکانے پر نوکر رہ چکی تھی۔ مگر رانیوں سے بات چیت کرنے کا سلیقہ اُسے ابھی تک نہ آیا تھا۔ اُس کا سوکھا ہوا چہرہ جوش سے تمتما اُٹھا۔ بلند آواز سے بولی۔ جس دن ایسی باتیں منہ سے نکالیگا مونچھیں اکھاڑ لوں گی۔ سرکار! وہ میرا غلام نہیں ہے، تو کیا میں ہی اس کی لونڈی ہوں۔ میں خود نہیں کھاتی۔ اسے کھلا دیتی ہوں۔ کیونکہ وہ مرد بچہ ہے۔

پلے داری میں اُسے مسکت کرنا پڑتا ہے۔ خود پھٹے پرانے کپڑے پہنتی ہوں لیکن اُسے میلا کپڑا نہیں پہننے دیتی۔ جب میں اُس کے لئے اتنا کرتی ہوں تو اُس کی کیا مجال ہے۔ کہ مجھے آنکھیں دکھا جائے۔ اپنے گھر کو آدمی اِس لئے چھاتا چھوتا ہے۔ کہ اُس سے برکھا کے وقت بچاؤ ہو۔ اگر یہ اندیشہ لگا رہے کہ گھر جانے کب گر پڑیگا۔ تو ایسے گھر میں کون رہیگا۔ اس سے تو روکھ تلے جا بیٹھنا کہیں اچھا۔ کل جانے کہاں بیٹھا گانا بجاتا رہا۔ دس بجے رات کو لوٹا میں رات بھر اُس سے بولی ہی نہیں۔ لگا پیروں پڑنے۔ گھگھیانے۔ تب میرا دل پسیج گیا۔ یہی مجھ میں عیب ہے۔ مجھ سے اُس کا غمگین چہرا نہیں دیکھا جاتا اسی لئے وہ کبھی کبھی شیر ہو جاتا ہے۔ لیکن اب میں بھی پکی ہو گئی ہوں۔ پھر کسی دن بگاڑ کیا، تو یاد ہی کریگا۔ یا وہ ہی رہیگا۔ یا میں ہی رہوں گی۔ جو بیٹھ کر کھائے وہ دھونس سہے۔ یہاں برابر کی کمائی کرتی ہوں۔

وسودھا نے اُسی انداز سے پھر پوچھا۔ اگر وہ تجھے بٹھا کر کھلاتا۔ تب تو اُس کی دھونس سہتی؟

مُنیا جیسے لڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ بولی۔ بٹھا کر کوئی کیا کھلائیگا سرکار۔ امرد باہر کا کام کرتا ہے، تو ہم بھی گھر میں کام کرتے ہیں۔ یا گھر کے کام میں کچھ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ باہر کے کام سے تو رات کو چھٹی مل جاتی ہے۔ گھر کے کام سے تو رات کو بھی چھٹی نہیں ملتی۔ مرد یہ چاہے، کہ مجھے گھر میں بٹھا کر آپ سیر سپاٹے کرتا پھرے، تو مجھ سے تو نہ سہا اس ہوگا۔

یہ کہتے کہتے مینا راجکمار کو لئے ہوئے باہر چلی گئی۔ وسودھا نے تھکی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر ہرا بھرا باغ تھا۔ جس کے رنگا رنگ پھول اپنی چندروزہ بہار کا جوبن دکھا رہے تھے اور پیچھے ایک عالیشان

مندر آسمان میں اپنا سہرا سر اُٹھائے سورج سے آنکھیں ملا رہا تھا۔ عورتیں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے پوجا کرنے آرہی تھیں۔ مندر کے دائیں طرف تالاب میں کنول صبح کے سرور میں مسکرا رہے تھے۔ لیکن قدرت کی اس دلآویزی میں بھی یہ طاقت نہ تھی کہ وسودھا کی طبیعت کو ہرا کر دیتی۔ اُسی تالاب کے کنارے ملاح کا ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ وسودھا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ باغ و بہار کے درمیان کھڑا وہ سونا جھونپڑا اُس کے عیش و عشرت سے گھرے ہوئے دل کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اُس کے جی میں آیا، کہ جا کر جھونپڑے کے گلے لپٹ جاؤں، اور خوب روؤں

وسودھا کو یہاں آئے پانچ سال گذر گئے تھے۔ پہلے وہ اپنی خوش نصیبی پر پھولی نہ سمائی تھی۔ ماں باپ کے چھوٹے سے کچے گھر کو چھوڑ کر وہ اس محل میں آگئی تھی۔ جہاں دولت اُس کے پیر چومتی تھی۔ اس وقت دولت ہی اسکی آنکھوں میں سب کچھ تھی۔ شوہر کی محبت دوسرے درجہ پر تھی۔ لیکن اُس کا حریص دل دولت پر مطمئن نہ رہ سکا۔ شوہر کی محبت کے لئے ہاتھ پھیلانے لگا۔ کچھ دنوں اُسے معلوم ہؤا۔ مجھے یہ دولت بھی میسر ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں یہ وہم دور ہو گیا۔ کنور گجراج سنگھ خوبصورت تھے، تندرست تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ بذلہ سنج تھے۔ اور محبت کا پارٹ کرنا بھی جانتے تھے۔ مگر اُن کی زندگی میں محبت سے مرتعش ہونے والا تار نہ تھا۔ وسودھا کا کھلا ہؤا شباب اور دیوتاؤں کو بھی لبھا لینے والا رنگ روپ محض اُن کی دل بستگی کا سامان تھا۔ گھڑ دوڑ اور شکار جیسے ولولہ انگیز مشاغل کے درمیان دب کر محبت پیلی اور نیم جان ہو گئی تھی۔ اور محبت سے محروم ہو کر اب وسودھا کا دل اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتا تھا۔ وہ چاند سے بچے پا کر بھی وہ خوش نہ تھی۔ کنور صاحب ایک مہینہ سے زیادہ ہؤا، شکار کے لئے گئے، اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔ اور یہ اپنی قسم کا پہلا موقعہ نہ تھا۔ ہاں اب اُس کی مدت میں اضافہ

ہو گیا تھا۔ پہلے ایک ہفتہ میں لوٹ آتے تھے۔ پھر دو ہفتوں کا دورہ چلا۔ اور اب ایک مہینے کی خبر لینے لگے۔ سال میں تین تین چار چار مہینے شکار کی نذر ہو جاتے تھے۔ شکار سے لوٹتے، تو گھڑ دوڑ کا راگ چھڑ جاتا۔ کبھی میرٹھ، کبھی پونا، کبھی بمبئی کبھی کلکتہ۔ گھر پر بھی رہتے، تو رئیس زادوں کے ساتھ گپ شپ اڑایا کرتے۔ شوہر کے یہ لچھن دیکھ کر وسودھا دل ہی دل میں کڑھتی اور گھلتی جاتی تھی۔ کچھ دنوں ہلکا ہلکا بخار بھی آنے لگا۔

وسودھا بڑی دیر تک بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر ٹیلیفون پر جا کر اس نے ریاست کے مینجر سے پوچھا۔ کنور صاحب کی کوئی چھٹی آئی۔

جواب ملا۔ جی ہاں! ابھی چھٹی آئی ہے۔ کنور صاحب نے ایک بہت بڑا شیر مارا ہے۔

وسودھا نے جل بھن کر کہا۔ "میں یہ نہیں پوچھتی۔ آنے کو کب لکھا ہے؟

مینجر۔ آنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔"

رانی۔ یہاں سے ان کا پڑاؤ کتنی دور ہے؟

مینجر۔ یہاں سے؟ دو سو میل سے کم نہ ہوگا۔ پیلی بھیت کے جنگلوں میں شکار ہو رہا ہے۔

رانی۔ میرے لئے دو موٹروں کا انتظام کر دیجئے۔ میں آج ہی وہاں جانا چاہتی ہوں۔

فون میں کئی منٹ بعد جواب ملا۔ ایک موٹر تو وہ ساتھ لے گئے ہیں۔ ایک حاکم ضلع کے بنگلہ پر بھیجدی گئی ہے۔ تیسری مینجر بنک کی سواری میں ہے۔ چوتھی کی مرمت ہو رہی ہے۔

رانی وسودھا کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ بولی کس کے حکم سے مینجر بنک اور

حاکم ضلع کو موٹریں بھیجی گئی ہیں۔ آپ دونوں منگوا لیجئے۔ میں آج ضرور جاؤنگی۔

مینجر۔ میں ابھی منگوائے دیتا ہوں،،

وسودھا نے سفر کی تیاری کرنی شروع کردی۔ اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا تصفیہ کرلیا۔ وہ قابل رحم زندگی بسر نہ کرے گی۔ وہ جا کر کنور صاحب سے کہیگی اگر آپ چاہتے ہیں۔ کہ میں آپ کی دولت کی لونڈی بن کر رہوں۔ تو یہ مجھ سے نہ ہوگا آپ کی شان و شوکت آپ کو مبارک ہو۔ میرا اختیار آپ کی دولت پر نہیں، آپ پر ہے۔ اگر آپ مجھ سے جبر سہنا چاہتے ہیں۔ تو میں آپ سے ہاتھ بھر بیٹ جاؤنگی اس طرح کی کتنی ہی باتیں اُس کے دل میں پانی کے بلبلوں کی طرح اُٹھ رہی تھیں

ڈاکٹر صاحب نے دروازہ پر آکر پکارا۔ میں اندر آجاؤں۔

وسودھا نے عاجزی سے کہا آج معاف کیجئے۔ میں ذرا پیلی بھیت جارہی ہوں

ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ آپ پیلی بھیت جارہی ہیں۔ بخار بڑھ جائیگا۔ اِس حالت میں آپ کو جانے کا مشورہ نہ دونگا۔

وسودھا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ بڑھ جائیگا، بڑھ جائے۔ مجھے اِس کی کوئی پرواہ نہیں۔

بوڑھا ڈاکٹر پردہ اٹھا کر اندر آگیا۔ اور وسودھا کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا لائیے ٹمپریچر لے لوں۔ اگر ٹمپریچر زیادہ ہوُا۔ تو میں نہ جانے دونگا۔

وسودھا۔ ٹمپریچر لینے کی ضرورت نہیں، میں نے فیصلہ کرلیا۔

ڈاکٹر۔ صحت کا خیال رکھنا آپ کا پہلا فرض ہے۔

وسودھا نے مسکرا کر کہا۔ آپ اطمینان رکھئے میں اتنی جلدی مری نہیں جارہی ہوں۔ پھر اگر کسی بیماری کی دوا موت ہی ہو۔ تو آپ کیا کرینگے۔

ڈاکٹر نے ایک دو مرتبہ اور زور دیا، پھر تعجب سے سر ہلا کر چلا گیا۔

(۲)

ریل گاڑی سے جانے میں آخری سٹیشن سے دس کوس تک غیر آباد جنگلی رستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے کنور صاحب ہمیشہ موٹر ہی سے جایا کرتے تھے۔ وسودھا نے بھی اسی رستہ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ دس بجتے بجتے دونوں موٹریں آگئیں۔ وسودھا نے سارا غصہ ڈرائیوروں پر اتارا۔ اب اگر میرے حکم کے بغیر کہیں موٹر لے گئے۔ تو کان پکڑ کر نکال دونگی۔ اچھی دلّگی ہے۔ گھر کی روئیں بن کی گائیں موٹریں لوگ اپنے لئے رکھتے ہیں، غیروں کے لئے نہیں۔ جسے سواری کا شوق ہو خرچ کرے۔ یہ نہیں کہ حلوائی کی دکان دیکھی، اور فاتحہ پڑھنے بیٹھ گئے۔

وہ چلی، تو دونوں بچے رونے لگے۔ مگر جب معلوم ہوا، کہ اماں بڑی دور ہوا مارنے جا رہی ہیں۔ تو اُن کی آتشِ شوق سرد ہو گئی۔ وسودھا نے آج صبح سے انہیں پیار نہ کیا تھا۔ اُس نے غصہ میں سوچا میں ہی کیوں انہیں پیار کروں۔ کیا میں نے ہی پیار کا ٹھیکہ لیا ہے۔ وہ تو وہاں چین سے بیٹھے رہیں۔ میں انہیں چھاتی سے لگائے رہوں۔ لیکن چلتے وقت ماں کا دل بیتاب ہو گیا۔ دونوں کو باری باری سے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ اور گھنٹہ بھر میں لوٹ آنے کا چکمہ دے کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ راہ میں بھی بچوں کی یاد بار بار آتی رہی۔ موٹر جس رفتار سے آگے جا رہی تھی۔ اُسی رفتار سے اس کا دل سامنے کے درختوں کے ساتھ پیچھے کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ کئی مرتبہ خواہش ہوئی۔ گھر لوٹ چلوں۔ جب انہیں میری پرواہ نہیں ہے، تو میں ہی کیوں اُن کے لئے جان دوں۔ خواہ آئیں یا نہ آئیں۔ پھر خیال آیا۔ ایک مرتبہ جا کر کھری کھری سنا آؤں۔ تو چین پڑے۔ سارا جسم تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ بخار بھی ہو گیا تھا۔ سر درد کے مارے پھٹا پڑتا تھا۔ لیکن آہنی ارادہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا

یہاں تک کہ جب وہ رات کے دس بجے ڈاک بنگلے میں پہنچی۔ تو اُسے تن بدن کی سدھ نہ تھی۔

شوفر کی آواز سنتے ہی کنور صاحب باہر نکل آئے اور پوچھا، تم یہاں کیسے آ گئے خیریت تو ہے؟

شوفر نے قریب آ کر کہا رانی صاحبہ آئی ہیں حضور! راہ میں بخار ہو گیا بیہوش پڑی ہیں۔ کنور صاحب نے وہیں کھڑے سخت لہجہ میں پوچھا۔ تو تم انہیں واپس کیوں نہ لے گئے۔ کیا تمہیں معلوم نہ تھا۔ کہ یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔

شوفر نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ حضور! وہ کسی طرح مانتی ہی نہ تھیں۔ میں کیا کرتا۔

کنور صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ چپ رہو۔ باتیں نہ بناؤ۔ تم نے سمجھا ہوگا۔ شکار کی بہار دیکھینگے۔ اور پڑے پڑے سوئیں گے۔ تم نے واپس چلنے کو کہا ہی نہ ہوگا۔ میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم کو ہوٹر لے کر اسی وقت لوٹنا پڑیگا۔ اور کون کون ساتھ ہے۔؟

شوفر نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا ایک موٹر پہ بستر اور کپڑے ہیں ایک پر خود رانی صاحبہ ہیں۔

کنور۔ یعنی اور کوئی ساتھ نہیں ہے۔

شوفر۔ حضور! میں تو حکم کا بندہ ہوں۔

کنور۔ بک بک مت کر دجی!

یوں جھلائے ہوئے کنور صاحب دسودہا کے پاس گئے۔ اور آہستہ سے پکارا جب کوئی جواب نہ ملا۔ تو انہوں نے آہستہ سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی توے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس بخار کی آنچ نے گویا اُن کے غصہ کی آگ کو سرد کر دیا۔ لپک کر بنگلے میں گئے۔ سوئے ہوئے آدمیوں کو جگایا۔ پلنگ بچھوایا۔ بیہوش

وسودھا کو گود میں اٹھا کر اندر لے گئے۔ اور پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر اُسے اشک آلود نگاہوں سے تاکنے لگے۔ اُس گرد سے بھرے ہوئے چہرے اور بکھرے ہوئے بالوں میں آج انہیں بے غرض محبت نظر آئی۔ آج تک انہوں نے وسودھا کو خود پرست نازنین کے روپ میں دیکھا تھا۔ جسے اُن کے پیار کی پرواہ نہ تھی۔ جو اپنے بناؤ سنگار میں مست تھی۔ آج گرد و غبار کے پوڈر اور پومیڈ میں انہوں نے اس کی نسائیت دیکھی۔ اُس میں کتنی حسرت تھی۔ کتنی التجا۔ اپنی پرواز کے سر در میں ڈوبی ہوئی چڑیا اب پنجرے کے دروازہ پر آکر پھڑپھڑا رہی تھی۔ کیا پنجرے کا دروازہ کھل کر اُس کا خیر مقدم نہ کریگا۔

باورچی نے پوچھا۔ کیا سرکار اکیلے آئی ہیں۔

کنور صاحب نے شیریں لہجہ میں جواب دیا۔ ہاں جی! اتنے آدمی ہیں۔ کسی کو ساتھ نہ لیا۔ ریل گاڑی میں بڑے آرام سے آسکتی تھیں۔ یہاں سے موٹر بھیج دیجاتی۔ کتنا تیز بخار ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔ ذرا سا پانی گرم کرو اور دیکھو کچھ کھانے کو بنا لو۔

باورچی نے کہا۔ سو کوس کی دوڑ بہت ہوتی ہے۔ سرکار! سارا دن بیٹھے بیٹھے بیت گیا۔

کنور صاحب وسودھا کے سر کے نیچے سرہانہ سیدھا کر کے بولے۔ اجی ہم لوگوں کا کچومر نکل جاتا ہے۔ پھر ان کی کیا بساط ہے۔ ایسی بیہودہ سڑک دنیا بھر میں نہ ہوگی۔

(۳)

وسودھا کا بخار بارہ دن تک نہ اُترا۔ گھر سے ڈاکٹر آئے۔ دونوں بچے۔ منیا

نوکر۔ چاکر بھی آگئے۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔ وسودھا پلنگ پر پڑے پڑے کنور صاحب
کی تندہی اور خدمت گذاریاں دیکھتی تھی۔ اور خوش ہوتی تھی۔ دس بجے تک جس کی
آنکھ نہ کھلتی تھی۔ وہی کنور صاحب اب منہ اندھیرے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اور اسکی
دوا دارو کا فکر کرنے لگتے تھے۔ ذرا سی دیر کے لئے ٹہلنے کو جاتے، پھر آکر بیٹھ
جاتے۔ جیسے تہجد کر رہے ہوں۔ ان کی صحت بگڑتی جاتی تھی۔ چہرے پر وہ سرخی اور
چمک نہ تھی۔ تھکے تھکے معلوم ہوتے تھے۔

ایک دن وسودھا نے پوچھا۔ تم آجکل شکار کھیلنے کیوں نہیں جاتے۔ میں تو
شکار کھیلنے ہی آئی تھی۔ نہ جانے کیسی بری ساعت میں چلی۔ کہ تمہیں اتنی تکلیف
اٹھانی پڑی۔ ذرا آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھو۔

کنور صاحب کو اتنے دنوں تک کبھی شکار کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ نہ اس کی کبھی
چرچا ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک شکاری نے کسی شیر کا ذکر کیا تھا۔ کنور صاحب نے
اس کی طرف ایسی قہر کی نگاہوں سے دیکھا۔ کہ اسے دوبارہ ہمت نہ پڑی۔ اب وہ
چاہتے تھے۔ ہمیشہ وسودھا کے پاس بیٹھ کر اُس سے باتیں کرتے رہیں۔ پل بھر کو
بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔ وسودھا کے منہ سے شکار کا ذکر سن کر ان کا سر
ندامت سے جھک گیا۔ آہستہ سے بولے۔ ہاں! شکار کھیلنے کا اس سے اچھا اور
کون موقعہ ہوگا۔

وسودھا بولی۔ میں تو اب بالکل اچھی ہوں۔ ذرا اپنی صورت دیکھو۔ بیمار کے
پاس بیٹھ کر آدمی سچ مچ بیمار ہو جاتا ہے۔

وسودھا نے تو معمولی سی بات کہی تھی۔ پر کنور صاحب کے دل پر وہ چنگاری
کی مانند لگی۔ اس سے پہلے وہ اپنے شکار کے جنون پر کئی مرتبہ پچھتا چکے تھے۔ سوچتے
تھے۔ اگر یوں شکار کے پیچھے نہ پڑتے۔ تو وسودھا بیمار کیوں ہوتی۔ یہ سب میرا ہی قصور ہے،

دسودھا پھر بولی۔ اب کے تم نے کیا کیا تحفے جمع کیئے۔ ذرا منگواؤ۔ میں بھی دیکھوں۔ اُن میں جو سب سے اچھا ہوگا۔ وہ میں لوں گی۔ اور ایک بات اور سن لو۔ اب کے تمہارے ساتھ میں بھی شکار کھیلنے چلوں گی۔ لے چلوگے نا۔ بہانے مت بنانا۔ میں ایک نہ سنوں گی

اپنے شکاری تحفے دکھانے کا کنور صاحب کو مرض تھا۔ سینکڑوں کھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ اُن کے کمروں میں فرش۔ گدے۔ کوچ۔ کرسیاں۔ مونڈھے سب کھالوں کے تھے۔ اوڑھنا اور بچھونا بھی کھالوں کا ہی تھا۔ کھالوں کے کئی سوٹ تیار کئے تھے۔ شکار کے موقعہ پر وہی سوٹ پہنتے تھے۔ اب کے بھی بہت سے سینگ، پنجے کھالیں جمع کی تھیں۔ انہوں نے سوچا۔ دسودھا یہ چیزیں دیکھ کر خوش ہو جائیگی۔ یہ نہ سمجھا۔ کہ اُس نے صدر دروازہ بند پاکر چور دروازہ سے گھسنے کی کوشش کی ہے۔ جاکر وہ اشیا اٹھا لائے۔ اور ایک ایک کرکے دکھانے لگے۔ دسودھا کے چہرے پر ایسی رونق ہفتوں سے نہ تھی۔ جیسے کوئی بچہ تماشا دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔ بیماری کے بعد ہم بچوں کی طرح ضدی ویسے ہی متلون مزاج ویسے ہی سادہ لوح بن جاتے ہیں۔ دسودھا ایک ایک کھال کو ایسی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے بائیسکوپ میں ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر آرہی ہو۔ سب سے خوبصورت ایک شیر کی کھال تھی۔ وہ اُس نے اپنے لئے پسند کی۔

کنور صاحب کی یہ سب سے قیمتی چیز تھی۔ وہ اِسے اپنے کمرہ میں لٹکانا چاہتے تھے۔ بولے تم کسی چیتے کی کھال لے لو۔ یہ تو کوئی عمدہ چیز نہیں ہے۔

دسودھا نے کھال کو اپنی طرف کھینچ کر کہا۔ رہنے دیجئے اپنا اپدیش۔ مجھے یہ خراب ہی پسند ہے۔

کنور صاحب نادم سے ہوکر بولے۔ تم یہی لے لو۔ میں تمہارے ہی خیال سے

کہتا تھا۔ میرا کیا ہے۔ میں پھر ایسا ہی شیر مارلونگا۔

وسودھا۔ تو مجھے چکمہ کیوں دیتے تھے۔

کنور۔ چکمہ کون دیتا تھا۔

وسودھا۔ تو کھاؤ میرے سر کی قسم کہ یہ کھال سب سے بڑھیا نہیں ہے

کنور صاحب نے شکست کی ہنسی ہنس کر کہا۔ قسم کیوں کھائیں۔ اِس ذرا سی کھال کے لئے۔ ایسی ایسی سو کھالیں ہوں۔ تو تمہارے سر پر نثار کر دوں

جب آدمی سب کھالیں لے کر چلا گیا۔ تو کنور صاحب نے کہا۔ میں اِس کھال پر سے باہا دن سے تمہارا نام لکھ کر تمہاری نذر کر دونگا۔

وسودھا تھک گئی تھی۔ پلنگ پر لیٹ کر بولی۔ اب میں بھی تمہارے ساتھ شکار کھیلنے چلوں گی۔

کنور صاحب مُسکرانے لگے۔

(۴)

وسودھا کو شکار کی کہانیاں سُننے کا چسکا سا پڑ گیا۔ اب تک کنور صاحب کی دنیا الگ تھی۔ جس کے دُکھ سُکھ۔ نفع نقصان۔ منے بگڑنے سے وسودھا کو کوئی سروکار نہ تھا۔ کنور صاحب اِس دنیا کی ہر ایک بات اُس سے چھپاتے تھے۔ مگر اب وسودھا اُن کی اِس دنیا میں ایک درخشاں ستارہ کی طرح طلوع ہوئی۔

ایک دن وسودھا نے کہا۔ مجھے بھی بندوق چلانا سکھا دو۔

ڈاکٹر صاحب کی اجازت ملنے میں توقف نہ ہوا۔ وسودھا تندرست ہو گئی تھی۔ کنور صاحب نے اچھی ساعت میں اُسے پہلا سبق پڑھایا۔ اس دن سے جب دیکھو درختوں کے نیچے کھڑی نشانہ بازی کی مشق کر رہی ہے۔ اور کنور صاحب

ساتھ کھڑے امتحان لے رہے ہیں۔ جس دن وسودھا نے پہلا باز مارا۔ کنور صاحب مسرّت سے اچھل پڑے۔ نوکروں کو بخشش دیگئی۔ براہمنوں کو دان۔ اس خوشی کی یاد میں باز کی ممی بنوائی گئی۔

وسودھا کی زندگی میں اب ایک نئی امنگ، ایک نئی راحت، ایک نئی اُمید تھی۔ پہلے کی طرح اس کا خالی دل اندیشوں سے نہ کانپتا تھا۔ اب اُس میں حوصلہ تھا۔ قوت تھی۔ محبت تھی۔

(۵)

آخر کئی دنوں کے بعد وسودھا کی تمنا بر آئی۔ کنور صاحب اُسے ساتھ لے کر شکار کھیلنے کو رضامند ہوئے اور شکار تھا۔ شیر کا اور شیر بھی وہ جس نے ایک مہینے سے گردونواح کے گاؤں میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ ایسی سخت کہ زمین اس کے بوجھ تلے کراہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی دونوں ایک بلند مچان پر بندوقیں لئے دم روکے بیٹھے تھے یہ شیر نہایت خوفناک تھا۔ ابھی ایک دن پیشتر ایک سوتے ہوئے آدمی کو کھیت میں مچان پر سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اُسی شیر کی گھات میں دونوں شکاری بیٹھے تھے۔ نیچے کچھ فاصلہ پر بھینسا باندھ دیا گیا تھا۔ اور شیر کے آنے کی راہ دیکھی جارہی تھی کنور صاحب مطمئن تھے۔ مگر وسودھا کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ ذرا سا پتا بھی ہلتا۔ تو وہ چونک پڑتی اور بندوق سیدھی کرنے کی بجائے کنور صاحب سے چمٹ جاتی۔ کنور صاحب اُس کی ہمت بندھاتے جاتے تھے۔ جوں ہی بھینسے پر آیا، میں اس کا کام تمام کردونگا۔ تمہاری گولی کی نوبت ہی نہ آنے پائیگی۔

وسودھا نے ڈر کر کہا۔ اور جو کہیں نشانہ چوک گیا تو اُچھلے گا۔

کنور - پھر دوسری گولی چلیگی - تینوں بندوقیں تو بھری رکھی ہیں - تمہارا دل گھبراتا تو نہیں ہے -

وسودھا - بالکل نہیں - میں تو چاہتی ہوں، پہلے میری بندوق چلے -

پتوں کے کھڑکھڑ کی آواز آئی - وسودھا چونک کر شوہر سے چمٹ گئی - کنور صاحب نے اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا - دل مضبوط کرو پیاری!

وسودھا نے ندامت سے جواب دیا - نہیں نہیں میں ڈرتی نہیں ہوں - ذرا چونک پڑی تھی -

معاً بھینسے کے پاس دو چنگاریاں سی چمک اُٹھیں - کنور صاحب نے آہستہ سے وسودھا کا ہاتھ دبا کر اُسے شیر کے آنے کی اطلاع دی اور ہوشیار ہو گئے - جب شیر نزدیک آ گیا - تو انہوں نے بندوق داغ دی - نشانہ خالی گیا - دوسرا فیر کیا - شیر زخمی تو ہوا - مگر گرا نہیں - غصہ سے پاگل ہو کر اس قدر زور سے گرجا - کہ وسودھا کا کلیجہ دہل گیا - کنور صاحب تیسرا فیر کرنے ہی کو تھے - کہ شیر نے مچان پر جست ماری - اُس کے اگلے پنجوں کے دھکے سے مچان ایسا ہلا - کہ کنور صاحب بندوق لئے مچان سے نیچے گر پڑے - کتنا نازک موقعہ تھا - اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی - تو کنور صاحب کی خیر نہ تھی - شیر کی جلتی ہوئی انگارہ سی آنکھیں وسودھا کے سامنے چمک رہی تھیں ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے - لیکن اس خطرہ نے جیسے اس کی نس نس میں بجلی بھر دی - اُس نے اپنی بندوق سنبھالی، شیر کے اور اُس کے درمیان دو ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا - وہ اُچک کر آیا ہی چاہتا تھا کہ وسودھا نے بندوق چھوڑ دی - دھائیں! شیر کے پنجے ڈھیلے پڑے - پیچھے گر پڑا - اب صورتِ حال اور بھی خطرناک تھی - شیر سے تین چار قدم کے فاصلے پر کنور صاحب گرے تھے - شاید چوٹ زیادہ آئی ہو - شیر میں اگر ابھی دم ہے، تو ضرور ان پر وار کریگا - وسودھا کی جان آنکھوں

بیں تھی ریوالور کلائیوں بیں۔ اِس وقت اگر کوئی اِس کے جسم میں نیزہ بھی چبھو دیتا
تو اسے خبر نہ ہوتی۔ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ پر اُس کی بے ہوشی ہی اس کی رہبر تھی
اُس نے ٹارچ جلائی۔ دیکھا شیر اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری گولی سر پر
ماری اور ریوالور لئے مچان سے کود پڑی۔ شیر زور سے غرآیا۔ وسودھا نے اُس کے
مُنہ کے سامنے ریوالور خالی کر دیا۔ کنور صاحب سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ اور دوڑ کر
وسودھا کو چھاتی سے لگا لیا۔ ارے! یہ کیا۔ وسودھا بے ہوش تھی۔ خوف اُس کی
جان کو مُٹھی میں لئے اُس کی حفاظت کر رہا تھا۔ خوف کے ہٹتے ہی بے ہوشی اُس
پر غالب آگئی۔

(۶)

تین گھنٹوں کے بعد وسودھا کو ہوش آیا۔ لیکن گھبراہٹ ابھی تک باقی تھی۔ اُس
نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کنور صاحب نے پوچھا۔ کیوں پیاری
کیا حال ہے اب؟

وسودھا نے بیہوشی میں اپنے ہاتھوں کا حلقہ بناتے ہوئے کہا۔ وہاں سے
ہٹ آؤ۔ کہیں حملہ نہ کر بیٹھے۔

کنور صاحب نے ہنس کر کہا۔ شیر کب کا ٹھنڈا ہو گیا۔ برآمدہ میں پڑا ہے۔ اتنا
بڑا شیر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

وسودھا۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟

کنور۔ بالکل نہیں۔ تم کود کیوں پڑیں۔؟ پیروں میں بڑی چوٹ آئی ہوگی مجھے
تو تعجب ہے۔ کہ تم بچ کیونکر رہیں۔ اتنی بلندی سے میں کبھی نہ کود سکتا۔

وسودھا۔ (تعجب سے) میں! میں کہاں کودی۔ شیر مچان پر آیا۔ اتنا یاد ہے

اس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔

کنور صاحب کو اور بھی تعجب ہُوا۔ واہ تم نے اُس پر دو گولیاں چلائیں۔ جب وہ نیچے گر پڑا۔ تو تم بھی کود پڑیں۔ اور اُس کے مُنہ میں ریوالور کی گولی ٹھونس دی۔ بڑا بے حیا جانور تھا۔ اگر تم چوک جاتیں تو وہ نیچے آتے ہی مجھ پر حملہ کرتا۔ میرے پاس چھری بھی نہ تھی۔ بندوق ہاتھ سے چھٹ کر دوسری طرف گر گئی تھی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مجھے تم نے بچا لیا۔ ورنہ اِس وقت میں یہاں کھڑا نہ ہوتا۔

دوسرے دن وہاں سے کوچ ہُوا۔

جو محل دسودھا کو پھاڑے کھاتا تھا۔ اس میں جا کر آج ایسی مُسرّت حاصل ہوئی جیسے کسی بچھڑی ہوئی سہیلی سے ملی ہو۔ ہر ایک چیز اُس کا خیر مقدم کرتی معلوم ہوتی تھی۔ جن نوکروں اور لونڈیوں سے وہ مہینوں سیدھے مُنہ بات بھی نہ کرتی تھی۔ اُن سے آج ہنس ہنس کر بولتی تھی۔ گویا گذشتہ سرد مہریوں کی تلافی کر رہی تھی۔

شام کا سورج آسمان کے سنہرے ساگر میں اپنی کشتی کھیتا چلا جا رہا تھا۔ دسودھا کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔ اِس منظر میں آج زندگی تھی، امید تھی، ولولہ تھا۔ ملاح کا وہ سونا جھونپڑا بھی آج کتنا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ قدرت میں دل کشی بھری تھی۔

مندر کے سامنے مُنیار اچکماروں کو کھلا رہی تھی۔ دسودھا کو مندر میں جا کر پوجا کرنے کا خیال آیا۔ اُس نے پوجا کا سامان منگوایا۔ اور مندر کی طرف چلی۔ خوشی کے بھرے خزانہ سے اب وہ کچھ خیرات بھی کر سکتی تھی۔ جلتے ہوئے دل سے شعلوں کے سوائے اور کیا نکل سکتا ہے۔

اتنے میں کنور صاحب آ کر بولے۔ اچھا پُوجا کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں بھی وہیں جا رہا تھا۔ کچھ دن ہوئے۔ میں نے ایک منت مانی تھی۔

وسودھا نے مُسکراتی ہوئی نگاہوں سے پوچھا۔ کیسی منت مانی تھی آپ نے ؟

کنور صاحب نے ہنس کر جواب دیا۔ یہ نہ بتاؤں گا ۔
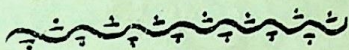
قاتل

جاڑوں کی رات تھی۔ دس بجے ہی سڑکیں بند ہو گئی تھیں۔ اور گلیوں میں سناٹا تھا۔ بوڑھی بیوہ ماں نے اپنے نوجوان بیٹے دھرم دیر کے سامنے تھالی پر سنتے ہوئے کہا۔ تم اتنی رات تک کہاں رہتے ہو۔ بیٹا۔ رکھے رکھے کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف سوتا پڑ گیا۔ آگ بھی تو اتنی نہیں رہتی۔ کہ اتنی رات تک بیٹھی تاپتی رہوں۔

دھرم دیر تشکیل، توانا، نوجوان تھا۔ تھالی کھینچتا ہوا بولا۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔ اماں۔ یہاں کے مردہ دل آدمی سر شام ہی سے سو جائیں۔ تو کوئی کیا کرے یوروپ میں لوگ بارہ ایک بجے رات تک سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کے لطف اٹھانا کوئی اُن سے سیکھ لے۔ ایک بجے کے پہلے تو کوئی سوتا ہی نہیں

ماں نے پوچھا۔ تو آٹھ دس بجے سو کر اُٹھتے بھی ہونگے۔ دھرم دیر نے پہلو بچا کر کہا۔ نہیں اُٹھتے۔ یں چھ بجے ہی۔ ہم لوگ بہت زیادہ سونے کے عادی ہیں۔ ۱۰ سے چھ تک آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے آدمی سوئے۔ تو کام کیا کریگا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ کہ آدمی کو آٹھ گھنٹے سونا چاہیئے۔

انسان جتنا کم سوئے اتنا ہی اچھا۔ ہماری سبھا نے اپنے دستور العمل میں
داخل کر لیا۔ کہ اس کے ممبروں کو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سونا چاہیئے۔

ماں اس سبھا کا ذکر سنتے سنتے تنگ آ گئی تھی۔ یہ نہ کھاؤ۔ وہ نہ کھاؤ۔ یہ نہ پہنو
وہ نہ پہنو، نہ بیاہ کرو۔ نہ شادی کرو، نہ نوکری کرو، نہ چاکری کرو۔ یہ سبھا
کیا آدمیوں کو سنیاسی بنا کر چھوڑیگی۔ اتنا تیاگ تو سنیاسی ہی کر سکتا ہے۔ تیاگی
سنیاسی بھی تو نہیں ملتے۔ انہیں بھی زیادہ تر نفس کے بندے، نام کے تیاگی ہیں
آج سونے کی قید بھی لگا دی۔ ابھی تین مہینے کی سیاحت ختم ہوئی ہے۔ جانے کہاں
کہاں مارے پھرے ہیں۔ اب بارہ بجے کھایئے یا کون جانے رات کا کھانا ہی
اُڑا دیں۔ اعتراض کے لہجہ میں بولی جب ہی تو یہ صورت نکل آئی ہے۔ کہ چاہو تو ایک
ایک ہڈی گن لو۔ آخر سبھا والے کوئی کام بھی کرتے ہیں۔ یا محض آدمیوں پر قیدیں
ہی لگایا کرتے ہیں۔

دھرم ویر بولا۔ جو کام تم کرتی ہو۔ وہی ہم بھی کرتے ہیں۔ تمہارا مقصد بھی قوم
کی خدمت ہے، ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔

بوڑھی بیوہ جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی۔ دس سال قبل اس کا
شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزا یاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت
خراب ہو گئی۔ اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عقیدت آمیز خلوص اور
انہماک سے خدمتِ قوم میں مصروف تھی۔ شروع میں اس کا نوجوان فرزند بھی رضا
کاروں میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر ادھر پانچ مہینوں سے وہ اس نئی سبھا میں شریک
ہو گیا تھا۔ اور اس کے سرگرم کارکنوں میں سمجھا جاتا تھا۔

ماں نے مشتبہ انداز سے پوچھا۔ تو تمہاری سبھا کا بھی کوئی دفتر ہے۔؟

ہاں ہے۔

اِس میں کتنے ممبر ہیں۔

ابھی تو صرف پچیس ممبر ہیں۔ لیکن وہ پچیس آدمی جو کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ تمہارے پچیس ہزار بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو اماں کسی سے کہنا مت۔ ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آ بنیگی۔ مجھے امید نہیں۔ کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر تو ہمیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔ یہاں کے لوگ اپنی عقل سے کام لیتے نہیں۔ ایک آدمی نے کہا۔ بول سوراجیہ مل جائیگا۔ بس آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آدمی خود گمراہ ہے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ دل میں اس خیال سے خوش ہو رہیں۔ کہ ہم آزادی کے قریب آتے جاتے ہیں۔ مگر مجھے تو یہ طرزِ عمل بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کے رونے دھونے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں۔ وہی ان لوگوں کو مل جائیگا۔ اصلی چیز جب ہی ملیگی جب ہم اُسکی قیمت دینے کو تیار ہونگے۔

ماں نے کہا۔ اسکی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے۔ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے۔ ہم نے اپنی جائیدادیں نہیں ضبط کرائیں؟

دھرم ویر۔ اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا۔ وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑینگے جب انہیں یقین ہو جائیگا۔ کہ اب ہم یہاں ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دئے جائیں۔ تو آج سوراجیہ مل جائے روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ اسی طرح آزاد ہوا۔ اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ہمیں ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے اُس پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اتنا ایک ہزار

جلوسوں سے ممکن نہیں۔

ماں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ اُسے بیوہ ہوئے دس سال ہو گئے یہی لڑکا اُس کی زندگی کا سہارا ہے۔ اسی کو سینہ سے لگائے محنت مزدوری کر کے اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے۔ اِس خیال سے خوش تھی۔ کہ یہ چار پیسے کمائے گا۔ گھر میں بہو آئیگی۔ ایک ٹکڑا کھاؤنگی۔ اور پڑی رہوں گی۔ آرزؤں کے پتلے پتلے تنکوں سے اُس نے ایک کشتی بنائی تھی۔ اور اسی پر بیٹھکر زندگی کے دریا کو پار کر رہی تھی۔ وہ کشتی اب اُسے لہروں میں جھکولے کھاتی ہوئی معلوم ہوئی ایسا معلوم ہُوا۔ کہ وہ کشتی دریا میں ڈوبی جا رہی ہے۔

اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیٹا تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ انگریزوں کو قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائینگے۔ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں، ہم اِس طرز حکومت کے دشمن ہیں۔ اگر یہ طرز حکومت ہمارے بھائی بندوں ہی کے ہاتھوں میں ہو۔ اور اُس کا بہت بڑا حصہ ہے بھی۔ تو ہم اُس کی بھی اِس طرح مخالفت کرینگے۔ روس میں تو کوئی دوسری قوم راج نہ کرتی تھی۔ پھر بھی رُوس والوں نے اس حکومت کو اکھاڑ پھینکا۔ اِس کا سبب یہی تھا۔ کہ زار رعایا کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُمرا مزے اڑاتے تھے۔ غریبوں کو پیسا جاتا تھا۔ یہ باتیں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ وہی حال ہمارا ہے۔ یہاں ایک عہدے دار ایک ہزار غریبوں کا حصہ کھا جاتا ہے۔ ملک کی دولت ایک نہ ایک بہانے سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ اور ہم غریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم اِس غیر آئینی حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ اِس سبھا سے اپنا نام کٹوا لو۔ خواہ مخواہ آگ میں نہ کودو۔ اور اگر تمہیں اپنی ضد ہو۔ تو مجھے زہر دیکر مار ڈالو۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ کہ تم عدالت میں خون کے جرم میں لائے جاؤ۔

دھرم ویر پر اس منت آمیز التجا کا کوئی اثر نہ ہؤا۔ بولا۔ اس کا کوئی خوف نہیں۔ ہم نے اس کے متعلق بہت کافی احتیاط کر لی ہے۔ گرفتار ہونا تو حماقت میں داخل ہے۔ ہم لوگ اس حکمت سے اپنا کام کرنا چاہتے ہیں۔ کہ کوئی گرفتار نہ ہو

ماں کے چہرے پر اب خوف کی جگہ شرمندگی کی جھلک نظر آئی۔ بولی یہ تو اس سے بھی بدتر ہے۔ بیگناہ سزا پائیں اور قاتل چین سے بیٹھے رہیں یہ شرمناک ہے۔ میں ایسے کمینہ پن سمجھتی ہوں۔ کسی کو چھپ کر قتل کرنا دغابازی ہے۔ مگر اپنے عوض اپنے بیگناہ بھائیوں کو پھنسا دینا۔ قوم فروشی ہے۔ ان بیگناہوں کا خون بھی قاتل کی گردن پر ہوگا۔

دھرم ویر نے اپنی ماں کی پریشانی کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ اماں تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تم اپنے دھرنے دئے جاؤ۔ جلوس نکالے جاؤ۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں ہمیں کرنے دو۔ گناہ اور ثواب، پاپ اور پن، دھرم اور ادھرم یہ بے معنی الفاظ ہیں۔ جس کام کو تم گناہ سمجھتی ہو۔ اسے میں عین ثواب سمجھتا ہوں۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ نسبتی الفاظ ہیں۔ تم نے بھگوت گیتا تو پڑھی ہے۔ کرشن بھگوان نے صاف کہا ہے۔ کہ مارنے والا میں ہوں، جلانے والا میں ہوں، آدمی نہ کسی کو مار سکتا ہے۔ نہ جلا سکتا ہے۔ پھر کہاں رہا تمہارا گناہ؟ مجھے اس بات کی کیوں شرم ہو۔ کہ میرے عوض کوئی دوسرا مجرم قرار دیا گیا۔ یہ انفرادی جنگ نہیں ہے۔ انگلینڈ کی مجموعی طاقت ہندوستان کی مجموعی طاقت سے برسر جنگ ہے۔ میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے۔ اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہو۔ اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔

ماں حیرت سے لڑکے کا منہ دیکھنے لگی۔ اس سے مباحثہ کرنا بے سود تھا اپنی دلیلوں سے وہ اسے قائل نہ کر سکتی تھی۔ دھرم ویر کھانا کھا کر اٹھ گیا۔ مگر

وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا۔ لڑکا جتنا کہہ رہا ہے۔ اُس سے
کہیں زیادہ اس کے دل میں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے۔ کہ وہ کسی کو قتل کر
آیا ہو۔ یا قتل کرنے جا رہا ہو۔ اِس خیال سے اسکے جسم میں رعشہ آگیا۔ عام آدمیوں
کی طرح قتل اور خون کی نفرت اُس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں بھری ہوئی
تھی۔ اُس کا اپنا فرزند قتل کا مرتکب ہو۔ اِس سے زیادہ شرم، ذلت، حقارت
اِس کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ قومی خدمت کے اُس معیار پر جان دیتی تھی
جو تیاگ، بے نفسی، خلوص اور صاف دلی کی برکت ہے۔ اُسکی نگاہ میں قوم کا خادم
وہ تھا۔ جو حقیر ترین مخلوق کا دل بھی نہ دکھلائے۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر خوشی سے
اپنے کو قربان کردے۔ اہنسا اِس کے اخلاقی احساسات کا جزوِ اعظم تھی۔ اگر
دھرم ویر کسی غریب کی حمائت میں گولی کا نشانہ بن جاتا۔ تو وہ روتی۔ تو ضرور مگر
گردن اٹھا کر، اِسے رُوحانی صدمہ ہوتا۔ شائد اِس صدمہ سے جانبر نہ ہوتی۔ مگر
اُس صدمہ میں غرور کا عنصر شامل ہوتا۔ لیکن وہ کسی کا خون کر آئے۔ یہ عذابی
قہر تھا۔ لعنت تھی!

لڑکے کو کیسے روکے؟ یہی سوال اِس کے سامنے تھا۔ وہ یہ نوبت ہرگز نہ
آنے دیگی۔ کہ اُس کا فرزند خون کے جرم میں گرفتار ہو۔ نہ اُسے یہی برداشت تھی۔ کہ
اُس کے جرم کی سزا، بیگناہوں کو ملے۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا۔ لڑکے میں یہ
شوریدہ سری آئی۔ کیونکر وہ کھانا کھانے بیٹھی۔ لقمہ حلق میں نہ جا سکا۔ کوئی ظالم
ہاتھ دھرم ویر کو اس کی گود سے چھینے لیتا ہے۔ وہ اس ہاتھ کو ہٹا دینا چاہتی تھی۔
اپنے لختِ جگر کو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ کریگی۔ سایہ کی طرح اس کے پیچھے رہیگی
کس کی مجال ہے۔ جو اس کے لڑکے کو اسکی گود سے چھینے۔ دھرم ویر باہر کے
کمرہ میں سویا کرتا تھا۔ اُسے گمان ہُوا۔ وہ کہیں چلا نہ گیا ہو۔ فوراً اِس کمرہ میں آئی

دھرم ویر کے سامنے چراغدان پر چراغ جل رہا تھا۔ وہ ایک کتاب کھولے۔ پڑھتا پڑھتا سو گیا تھا۔ کتاب اس کے سینہ پر پڑی ہوئی تھی۔ ماں نے وہیں بیٹھ کر یکسانہ خلوص اور انکسار کے ساتھ پرماتما سے اس کی تالیف قلب کے لئے دعا کی۔ اس کے چہرہ پر اب بھی وہی بھولاپن، وہی معصومیت تھی۔ جو پندرہ بیس سال پہلے نظر آتی تھی۔ تندی یا کرختگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ ماں کی اصول پروری ایک لمحہ کے لئے مامتا کے دامن میں چھپ گئی۔ ماں کے دل نے بیٹے کے دلی جذبات کو دیکھا۔ اس نوجوان دل میں خدمت کا کتنا جوش ہے۔ قوم کا کتنا درد ہے! مظلوموں سے کتنی ہمدردی ہے! اگر اس میں بوڑھوں کی مصلحت اندیشی، صبر آہستہ روی نہیں ہے۔ تو اس کی کیا وجہ ہے۔ جو شخص جان جیسی عزیز چیز کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اس کی تڑپ اور جلن کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ کاش یہ جوش، یہ درد ہنسا کے پنجہ سے نکل سکتا تو بیداری کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی

ماں کی آہٹ پا کر دھرم ویر چونک پڑا۔ اور کتاب سنبھالتا ہوا بولا۔ تم کب آ گئیں اماں، مجھے تو نہ جانے کب نیند آ گئی

ماں نے چراغدان کو دور ہٹا کر کہا۔ چارپائی کے پاس چراغ رکھ کر نہ سویا کرو۔ اس سے کبھی کبھی حادثے ہو جایا کرتے ہیں۔ اور کیا ساری رات پڑھتے ہی رہو گے۔ آدھی رات تو ہوئی۔ آرام سے سوؤ۔ میں بھی یہیں لیٹی جاتی ہوں۔ مجھے اندر نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے۔

دھرم ویر۔ "تو میں ایک چارپائی لا کر ڈالے دیتا ہوں"۔

نہیں، میں یہیں زمین پر لیٹی جاتی ہوں۔

واہ میں چارپائی پر لیٹوں گا۔ اور تم زمین پر پڑی رہو گی۔ تم چارپائی پر آ جاؤ۔

"چل میں چارپائی پر لیٹوں۔ اور تو زمین پر پڑا رہے۔" تو یہ تو نہیں ہو سکتا۔ میں چارپائی لئے آتا ہوں۔ نہیں میں بھی اندر ہی لیٹتا ہوں۔ آج ڈر میں کیوں؟"

"تمہاری باتوں نے ڈرا دیا اور کیا۔ مجھے بھی کیوں اپنی سبھا میں نہیں شریک کر لیتا۔"

دھرم دیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بستر اور چارپائی اُٹھا کر اندر والے کمرہ میں لے چلا۔ ماں آگے آگے چراغ دکھاتی ہوئی چلی۔ کمرہ میں چارپائی ڈال کر اُس پر لیٹتا ہوا بولا۔ اگر تم میری سبھا میں شریک ہو جاؤ۔ تو کیا پوچھنا۔ بچارے کچی کچی روٹیاں کھا کر بیمار ہو رہے ہیں۔ انہیں اچھا کھانا ملنے لگیگا۔ پھر ایسی ہی کتنی باتیں ہیں جنہیں ایک بوڑھی عورت جتنی آسانی سے کر سکتی ہے۔ نوجوان ہرگز نہیں کر سکتے۔ مثلاً کسی معاملہ کا سراغ لگانا۔ عورتوں میں ہمارے خیالات کی اشاعت کرنا۔ مگر تم مذاق کر رہی ہو؟

ماں نے متانت سے کہا نہیں بیٹا، مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ دل سے کہہ رہی ہوں۔ ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ تمہیں اتنے بڑے خطرے میں تنہا چھوڑ کر میں گھر میں نہیں بیٹھ سکتی۔ جبتک مجھے کچھ نہ معلوم تھا۔ دوسری بات تھی۔ لیکن اب یہ سب حالات جان لینے کے بعد میں تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتی۔ میں ہمیشہ تمہارے پہلو میں رہوں گی۔ اور اگر کوئی ایسا موقعہ آیا۔ تو تم سے پہلے میں اپنے تئیں قربان کر دوں گی۔ مرتے وقت تم میرے سامنے ہو گے۔ میرے لئے یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ یہ مت سمجھو۔ کہ میں نازک موقعوں پر ڈر جاؤنگی۔ چیخوں چلاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ سخت سے سخت خطروں کے سامنے بھی تم میری زبان سے ایک بھی چیخ نہ سنو گے۔ اپنے بچے کی حفاظت کے لئے گائے بھی شیرنی بن جاتی ہے۔

دھرم ویر نے عقیدت سے سرشار ہوکر ماں کے قدموں کا بوسہ لے لیا
اُس کی نگاہوں میں وہ کبھی اتنی تعظیم اور محبت کے قابل نہ تھی۔

(۲)

دوسرے ہی دن آزمائش کا موقعہ درپیش ہوا۔ یہ دو دن بڑھیا نے ریوالور کی مشق میں صرف کئے۔ ٹپاخے کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھنے والی، اہنسا اور دھرم کی دیوی اتنی دلیری سے ریوالور چلاتی تھی۔ اُس کا نشانہ اتنا بے خطا ہوتا تھا کہ سبھا کے نوجوانوں کو بھی حیرت ہوتی تھی۔

پولیس کے ایک افسر اعلیٰ کے نام موت کا پروانہ نکلا۔ اور یہ خدمت دھرم ویر کے سپرد ہوئی۔

دونوں گھر پہنچے۔ تو ماں نے پوچھا، کیوں بیٹا، اِس افسر نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی پھر سبھا نے کیوں اِس کا انتخاب کیا؟

دھرم ویر ماں کی سادگی پر مسکرا کر بولا۔ تم سمجھتی ہو۔ کہ ہمارے کانسٹبل اور سب انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ جو کچھ کرتے ہیں۔ اپنی خوشی سے کرتے ہیں؟ وہ لوگ جتنے مظالم کرتے ہیں۔ اُن کے لئے یہی شخص ذمہ وار ہے۔ اور پھر ہمارے لئے تو اتنا ہی کافی ہے۔ کہ یہ اِس مشین کا ایک خاص پُرزہ ہے۔ جو ہماری قوم کو انتہائی بیرحمی سے پامال کر رہی ہے۔ لڑائی میں ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں وہاں تو مخالف فریق کا ممبر ہونا ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔

ماں خاموش ہو گئی۔ ایک لمحہ کے بعد ڈرتے ڈرتے بولی۔ بیٹا میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ اب ایک سوال کرتی ہوں۔ اِسے پورا کروگے!

دھرم ویر نے کہا۔ یہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اماں تم جانتی ہو۔ میں

تمہارے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔

ماں۔ ہاں بیٹا۔ یہ جانتی ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے یہ سوال کرنے کی جرأت ہوئی۔ تم اس سبھا سے الگ ہو جاؤ۔ دیکھو تمہاری بوڑھی ماں ہاتھ باندھ کر تم سے یہ عرض کر رہی ہے۔

ماں ہاتھ باندھ کر سائلانہ انداز سے بیٹے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

دھرم دیر نے قہقہہ مار کر کہا۔ یہ تو تم نے نئے ڈھب سوال کیا۔ اماں۔ تم جانتی ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ زندہ لوٹ کر نہ آؤنگا۔ اگر یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں تو بھی جان نہیں بچ سکتی۔ سبھا کے سب ہی ممبر میرے خون کے پیاسے ہو جائینگے اور مجھے ان کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑیگا۔ تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے۔ اسے تمہارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں۔ لیکن مادر وطن نے تمہیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے۔ اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقعہ آ جائے۔ کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت کے لئے تمہیں قتل کرنا پڑے۔ تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منہ نہ موڑ سکونگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہونگے۔ لیکن تلوار تمہاری گردن پر ہوگی۔ ہمارے مذہب میں قوم کے مقابلہ میں کسی چیز کی حقیقت نہیں۔ اس لئے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ ہاں تمہیں خوف ہو۔ تم میرے ساتھ نہ جاؤ۔ میں کوئی بہانہ کر دونگا۔ اور کسی دوسرے کامریڈ کو ساتھ لے لونگا۔ اگر تمہارے دل میں ضعف ہو تو مجھے فوراً بتلا دو

ماں نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا۔ میں نے تمہارے خیال سے کہا تھا۔ بھیا ورنہ مجھے کیا خوف!

تاریکی شب کے پردہ میں اس مہم کو انجام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ معتوب راج کو کلب سے جس وقت لوٹے۔ وہیں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے۔ دھرم دیر

نے دوپہر ہی کو موقع کا معائنہ کر لیا۔ اِس خاص مقام کا اِنتخاب بھی کر لیا۔ جہاں سے وہ نشانہ مار یگا۔ صاحب کے بنگلہ کے قریب کریل اور کروندے کی ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی۔ وہی اسکی کمینگاہ ہوگی۔ جھاڑی کے بائیں جانب نشیب تھا۔ نشیب میں بیر اور امرود کے باغ تھے۔ بھاگ نکلنے کا اچھا موقعہ تھا۔

صاحب کے کلب جانے کا وقت سات اور آٹھ بجے کے درمیان تھا لوٹنے کا وقت گیارہ یا بارہ بجے تھا۔ ان اوقات کی تحقیق کر لی گئی تھی۔ دھرم دیر نے طے کیا۔ کہ نو بجے چل کر اسی کروندے والی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ وہیں ایک موڑ بھی تھا۔ موڑ پر موٹر کی رفتار کچھ سست ہو جائیگی۔ بس اسی وقت اسے ریوالور کا نشانہ بنا لیا جائے۔

جوں جوں دن گذرتا تھا۔ بوڑھی ماں کا دل دہشت سے خشک ہوتا جاتا تھا دھرم دیر کے معمول میں مطلق فرق نہ تھا۔ وہ معین وقت پر اٹھا۔ ناشتہ کیا۔ سندھیا کی حسب معمول کچھ دیر پڑا رہا۔ دو چار احباب آ گئے۔ اُن کے ساتھ دو تین بازیاں شطرنج بھی کھیلیں۔ اطمینان سے کھانا کھایا۔ اور معمول سے کچھ زیادہ۔ پھر آرام سے سویا۔ گویا اسے کوئی غم نہیں ہے۔ ماں کا دل اچاٹ تھا۔ کھانے پینے کا تو ذکر ہی کیا وہ من مار کر ایک جگہ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ پڑوس کی کئی عورتیں حسب معمول آئیں۔ مگر وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوئی۔ ایک سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ گویا چوہیا بلی کے خوف سے کوئی سوراخ ڈھونڈتی ہو۔ کوئی پہاڑ سا اس کے سر پر گرتا تھا۔ اِس سے کہیں نجات نہیں۔ کہیں مفر نہیں۔ وہ رسمی فلسفہ جس سے اب تک اسے تسکین ہوتی تھی۔ تقدیر۔ پُنر جنم۔ مشیت اِس بلائے مہیب کے سامنے بیکار سے معلوم ہوتے تھے۔ زرہ اور بکتر اور خود تیر اور تفنگ سے حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن پہاڑ تو اسے ان ساری دفاعی آلات کیساتھ کچل ڈالیگا۔ اِس

کے دل و دماغ مفلوج ہوتے جاتے تھے۔ اگر کوئی احساس تھا۔ تو وہ دہشت کا۔ مگر شام ہوتے ہوتے اس کے دل پر ایک سکون کی حالت طاری ہوئی۔ اس کے اندر ایک طاقت پیدا ہوئی۔ جسے مجبوری کی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ چڑیا اس وقت پھڑپھڑائی جب تک اسے اڑ نکلنے کی امید تھی۔ اس کے بعد وہ پنجہ صیاد اور تیغ قاتل کے لئے تیار ہو گئی۔ انتہائی خوف کا نام دلیری ہے۔

اس نے دھرم ویر کو پکارا۔ بیٹا کچھ آ کر کھا لو۔

دھرم ویر اندر آیا۔ آج سارے دن ماں اور بیٹے میں ایک بات بھی نہ ہوئی تھی۔ اس وقت ماں نے دھرم ویر کو دیکھا۔ تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ ضبط جس سے آج اس نے دن بھر اپنے اندرونی اضطراب کو چھپا رکھا تھا۔ جواب تک بے کسی کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا۔ خطرہ کے قریب آ جانے پر پگھل گیا تھا۔ جیسے کوئی بچہ ہوا کو دور سے دیکھ کر تو خوشی سے تالیاں بجائے۔ لیکن اس کے قریب آنے پر چیخ اٹھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں رونے لگے۔

ماں کا دل مسرت سے کھل اٹھا۔ اس نے آنچل سے دھرم ویر کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ چلو بیٹا یہاں سے کہیں بھاگ چلیں۔

دھرم ویر خیال میں غرق کھڑا تھا۔

ماں نے پھر کہا۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے دور نکل جائیں۔ جس میں کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ قوم کی خدمت کرنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔

دھرم ویر کی محویت بیدار ہوئی۔ بولا یہ نہیں ہو سکتا۔ اماں فرض تو فرض ہے اسے ادا کرنا پڑیگا۔ چاہے رو کر ادا کر دوں یا ہنس کر۔ ہاں اس خیال سے وحشت

ہوتی ہے۔ کہ انجام نہ جانے کیا ہو۔ ممکن ہے نشانہ خطا کر جائے اور گرفتار ہو جاؤں یا اس کی گولی کا نشانہ بنوں۔ لیکن اب تو ہر چہ باداباد مر بھی جائینگے۔ تو نام تو چھوڑ جائینگے ایک لمحہ کے بعد اس نے پھر کہا۔ اس وقت تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ اماں اب طیاری کرنی چاہئے۔ تمہارا جی نہ چاہتا ہو تو نہ چلو میں اکیلا چلا جاؤنگا۔

ماں نے شکوہ کے انداز سے کہا۔ مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں ہے۔ بیٹا میری جان تو تم تھے۔ تمہیں کو دیکھ کر جیتی تھی۔ تمہیں چھوڑ کر میری زندگی اور موت دونوں برابر ہیں۔ بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔

دھرم ویر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دونوں اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہوئے۔ ماں کی تیاری ہی کیا تھی۔ ایک بار ایشور کا دھیان کیا۔ ریوالور لیا۔ اور چلنے کو تیار ہو گئی دھرم ویر کو اپنا روزنامچہ بھرنا تھا۔ وہ روزنامچہ لکھنے بیٹھا۔ تو جذبات کا دریا امنڈ پڑا۔ یہ روانی۔ یہ آمد اس کے لئے نئی چیز تھی۔ جیسے دل میں کہیں سوتا کھل گیا ہو۔ انسان لافانی ہے۔ امر ہے یہی اس روانی کا موضوع تھا۔ آغاز ایک دردناک الوداع سے ہوا۔

رخصت! اے دنیا کی دلچسپیو رخصت! اے زندگی کی بہارو! رخصت اے زخم ہائے شیریں رخصت! برادران وطن! اپنے اس محروم اور مجروح خادم کے لئے دعاء خیر کرنا۔ زندگی اتنی عزیز ہے۔ اس کا آج تجربہ ہوا۔ آہ! وہی غم والم کے نشتر وہی حسرتیں اور مایوسیاں جنہوں نے زندگی کو تلخ کر رکھا تھا۔ فی الواقع سرمایہ حیات ہیں۔ یہ نور سحر کی سنہری بارش یہ شام کی رنگین ہوائیں یہ گلی کوچے یہ در و دیوار دیکھنے پھر نہ نصیب ہوں گے۔ زندگی بندشوں کا نام ہے بندشیں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی ہیں۔ حیات کا شیرازہ بکھرا جا رہا ہے۔ اے دل کی آرزوؤ آؤ تمہیں گور حسرت میں دفن کر دوں۔ خدا سے یہی دعا ہے۔ کہ

اہل وطن پھلیں پھولیں۔ وطن سرسبز اور شاداب ہو۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم نہ ہونگے۔ ہم کیا اور ہماری حقیقت ہی کیا۔ مگر گلشن بلبلوں سے خالی نہ رہیگا۔ میری اپنے بھائیوں سے اتنی ہی التجا ہے کہ جس وقت آپ آزادی کے نغمے گائیں تو اس غریب کو بھی دعاء خیر سے یاد کریں۔

روزنامچہ بند کرکے اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے پہنے۔ ریوالور جیب میں رکھا۔ اور بولا اب تو وقت ہو گیا اماں۔

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ گھر سنبھالنے کی کسے پرواہ تھی۔ جو چیز جہاں پڑی تھی وہیں پڑی رہی۔ یہاں تک کہ چراغ بھی گل نہ کیا گیا۔ دونوں خاموش گھر سے نکلے ایک مردانہ وار قدم اٹھاتا ہوا دوسری متفکر اور مغموم اور بار مجبوری سے جھکی ہوئی۔ راستہ میں بھی تبادلہ الفاظ نہ ہوا۔ دونوں نوشتہ تقدیر کی طرح اٹل۔ خاموش اور سرگرم تھے۔ حصہ نثر پر شکوہ قوی اور تحریک عمل سے متحن۔ حصہ نظم درد اور تاثیر اور التجا سے لرزاں۔

جھاڑی میں پہنچکر دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد صاحب کا موٹر نکلا۔ دھرم ویر نے غور سے دیکھا۔ موٹر کی رفتار سست تھی صاحب اور لیڈی دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ نشانہ کا غیر متوقعہ موقعہ تھا۔ دھرم ویر نے جیب سے ریوالور نکالا۔

ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور موٹر آگے نکل گئی۔ دھرم ویر نے کہا۔ یہ تم نے کیا کیا اماں۔ ایسا سنہرا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

ماں نے کہا۔ موٹر میں میم بھی تو تھی۔ کہیں میم ہی کے گولی لگ جاتی تو!

تو کیا مضائقہ تھا۔ ہمارے مذہب میں ناگ اور ناگن اور سپنولے میں کوئی فرق نہیں۔

ماں نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا۔ تو تمہارا مذہب درندوں اور وحشیوں کا ہے جو جنگ کے بنیادی اصولوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ عورت ہر ایک مذہب میں معصوم سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وحشی بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔

میں واپسی کے وقت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

میرے جیتے جی تم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے!!

میں اس معاملہ میں تمہاری پابندیوں کا غلام نہیں ہو سکتا۔

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نامردانہ ضرب سے اس کی ممتا ریزہ ریزہ ہوگئی مشکل سے بیس منٹ گذرے ہونگے۔ کہ وہی موٹر دوسری جانب سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ دھرم ویر نے موٹر کو غور سے دیکھا۔ اور اچھلکر بولا۔ لو اماں اکی صاحب اکیلا ہی ہے۔ تم بھی میرے ساتھ نشانہ لگانا

ماں نے لپک کر دھرم ویر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجنونانہ تندی کیساتھ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے لگی۔ دھرم ویر نے اس کو ایک دھکا دیکر گرا دیا۔ اور ایک قدم ہٹ کر ریوالور سادھا۔ ایک سیکنڈ میں ماں اٹھی۔ اسی وقت گولی چلی۔ موٹر آگے نکل گئی۔ مگر ماں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

دھرم ویر ریوالور پھینک کر ماں کے پاس گیا۔ اور گھبرا کر بولا۔ اماں! کیا ہوا!؟ پھر یکایک اس سانحہ کا علم اس کے اندر جھلک اٹھا۔ وہ اپنی پیاری ماں کا قاتل ہے اس کی فطرت کی ساری درشتی اور تیزی اور گرمی بجھ گئی۔ آنسوؤں کی بڑھتی ہوئی لرزش کو محسوس کرتا ہوا وہ نیچے جھکا۔ اور ماں کے چہرہ کی طرف اشک آلودہ پشیمانی سے دیکھکر بولا۔ یہ کیا ہوگیا۔ اماں! ہائے تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟ یہ کیسے ہوگیا۔ اندھیرے میں کچھ نظر بھی تو نہیں آتا۔ کہاں گولی لگی۔ کچھ بتاؤ۔ آہ! اس بدنصیب کے ہاتھوں تمہاری موت لکھی تھی! جس کو تم نے گود میں پالا۔ وہی تمہارا قاتل ہوا۔ کس کو بلاؤں

کوئی نظر بھی تو نہیں آتا۔

ماں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ میرا جنم سپھل ہو گیا۔ بیٹا تمہارے ہاتھوں میری مٹی اُٹھیگی۔ تمہاری گود میں مر رہی ہوں۔ سینہ میں زخم ہو گیا ہے۔ جونہی تم نے گولی چلائی۔ میں تمہارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اب نہیں بولا جاتا۔ پرماتما تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ میری یہ دعا ہے، میں اور کیا کرتی بیٹا۔ ماں کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تو چلی۔

ایک لمحہ کے بعد اس تاریک سناٹے میں دھرم ویر اپنی عزیز ماں کے تن بیجاں کو گود میں لئے گھر چلا تو اس کے ٹھنڈے تلوؤں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں رگڑ کر روحانی مسرت سے بھری ہوئی خلش محسوس کر رہا تھا۔

دُکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ اور اسکی بیوی جھُریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے تو چمارن نے کہا۔ تو جاکر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں۔

دُکھی۔ ہاں جاتا ہوں۔ لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟

جھُریا:۔ کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائیگی۔ ٹھکرانی سے مانگ لانا۔

دُکھی۔ تو تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے۔ کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دینگے۔ جاکر ایک لوٹا پانی مانگوں تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دیگا۔ ہمارے اوپلے، ایندھن، بھوسا، لکڑی، تھوڑے ہی ہیں۔ کہ جو چاہے اٹھا لے جائے۔ اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ اُن کے آتے آتے سوکھ جائیگی۔

جھُریا۔ ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھینگے۔ دیکھتے نہیں۔ کتنے نیم دھرم سے رہتے ہیں۔

دُکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا۔ ”ہاں یہ بات تو ہے۔ مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتل بنا لوں۔ تو ٹھیک ہو جائے۔ پتل میں بڑے بڑے آدمی کھاتے ہیں۔ وہ پاک ہے۔ لا۔ تو لاٹھی۔ پتے توڑ لوں۔

جھریا - پتل میں بنالونگی - تم جاؤ - لیکن ہاں اُنہیں سیدھا بھی تو دینا ہوگا - اپنی تھالی میں رکھ دوں ؟

دُکھی - کہیں ایسا گجب نہ کرنا - نہیں تو سیدھا بھی جائے - اور تھالی بھی پھوٹے بابا تھالی اٹھا کر پٹک دینگے - وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں - غصہ میں پنڈتانی تک کو بھی نہیں چھوڑتے - لڑکے کو ایسا پیٹا - کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لئے پھرتا ہے پتل میں سیدھا بھی دیدینا - مگر چھونا مت - بھوری گونڈ کی لڑکی کو لیکر شاہ کی دکان سے سب چیزیں لے آنا - سیدھا بھر پور سیر بھر آٹا - آدھ سیر چاول - پاؤ بھر دال - آدھ پاؤ گھی - نمک ہلدی اور پتل میں ایک کنارے چار آنہ پیسے رکھ دینا گونڈ کی لڑکی نہ ملے - تو بھرجن کے ہاتھ پیر جوڑ کر لے آنا - تو کچھ نہ چھونا - ورنہ گجب ہو جائے گا -

ان باتوں کی تاکید کر کے دُکھی نے لکڑی اٹھالی - اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لیکر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا - خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا نذرانہ کے لئے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا - اُسے خالی ہاتھ دیکھ کر تو باباجی دُور ہی سے دُھتکارتے -

(۲)

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے - نیند کھلتے ہی ایشور اُپاسنا میں لگ جاتے - منہ ہاتھ دھوتے دھوتے آٹھ بجتے - تب اصلی پوجا شروع ہوتی - جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی - اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے - پھر آئینہ کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے - چندن کے متوازی خطوں کے درمیان لال رولی کا ٹیکہ ہوتا تھا - پھر سینہ پر، دونوں بازوؤں پر چندن

کے گول گول دائرے بناتے۔ اور ٹھاکر جی کی مُورتی نکال کر اسے نہلاتے۔ چندن لگاتے
پھول چڑھاتے۔ آرتی کرتے اور گھنٹی بجاتے۔ دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اُٹھتے اور
بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اِس وقت دو چار جمان دروازے پر آجاتے۔ ایشور اُپاسنا
کا فی الفور پھل مل جاتا۔ یہی ان کی کھیتی تھی۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے۔ تو دیکھا۔ دکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لئے بیٹھا
ہے۔ انہیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ
باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا پُرجلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پر ہو گیا۔ کتنی تقدس
تاب صورت تھی۔ چھوٹا سا گول مول آدمی، چکنا۔ سر پھولے ہوئے رخسار، روحانی
جلال سے منور آنکھیں۔ اس پر رولی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدیس عطا کر دی
تھی۔ دُکھی کو دیکھ کر شیریں لہجے میں بولے۔ آج کیسے چلا رے دُکھیا؟

دُکھی نے سر جھکا کر کہا۔ بیٹا کی سگائی کر رہا ہوں۔ مہاراج۔ ساعت شگن بچارنا
ہے۔ کب مرجی، ہوگی۔

گھاسی۔ آج تو مجھے چُھٹی نہیں ہے۔ ہاں شام تک آجاؤں گا۔

دکھی۔ نہیں مہاراج! جلدی، مرجی، ہو جائے۔ سب سامان ٹھیک کر
آیا ہوں۔ یہ گھاس کہاں رکھ دوں۔

گھاسی:۔ اِس گئے کے سامنے ڈال دے۔ اور ذرا جھاڑو لیکر دروازہ تو
صاف کر دے۔ یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ
دے۔ تب تک میں بھوجن کر لوں۔ پھر ذرا آرام کر کے چلوں گا۔ ہاں یہ لکڑی بھی
چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسا پڑا ہے۔ اُسے بھی اُٹھا لانا۔ اور بھوسیلے
میں رکھ دینا

دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دروازے پر جھاڑو لگائی۔ بیٹھک کو گوبر

سے لیا۔ اِس وقت ۱۲ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا؟ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے۔ تو پنڈت جی بگڑ جائیں بیچارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی۔ جس پر پہلے کتنے ہی بھگتوں نے اپنا زور آزما لیا تھا۔ وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لئے تیار تھی۔ دُکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا تھا۔ لکڑی چیرنے کا اسے محاورہ نہ تھا۔ گھاس اُس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی۔ یہاں کس کس کر کلہاڑی کا بھرپور ہاتھ جماتا۔ لیکن اُس گرہ پر نشان تک نہیں پڑتا تھا۔ کلہاڑی اچٹ جاتی۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اٹھتا تھا۔ ہاتھ اٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ کمر نہ سیدھی ہوتی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا ہو رہا تھا۔ سر میں چکر آ رہے تھے۔ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پھر بھی اپنا کام کئے ہی چلا جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا تو شاید کچھ طاقت آتی۔ اس نے سوچا۔ یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملیگی۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا ہی پیتے ہیں۔ یکایک اسے یاد آیا۔ کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔ اس کے ہاں ضرور چلم تمباکو ہوگی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا۔ خیر محنت تو سپھل ہوئی۔ اُس نے تمباکو بھی اور چلم بھی دی۔ لیکن آگ وہاں نہیں تھی۔ دُکھی نے کہا۔ آگ کی فکر مت کرو۔ بھائی پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لونگا۔ وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی۔

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لیکر چلا آیا۔ اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے دروازے پر کھڑا ہو کر بولا۔ مالک ذرا سی آگ مل جائے۔ تو چلم پی لیں۔

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتائی نے پوچھا۔ یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے

اُرے وہی سُسرا اُو گھبا چمار ہے۔ کہا ہے نخوڑی سی لکڑی چھیر دے
آگ تو ہے دیدو۔

پنڈتانی نے بھویں چڑھا کر کہا۔ تمہیں تو جیسے پوتھی پترے کے پھیر میں
دھرم کرم کی سُدھ بھی نہیں رہی۔ چمار ہو۔ دھوبی ہو۔ پاسی ہو۔ مُنہ اُٹھائے گھر
میں چلا آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا۔ کوئی سرائے ہوئی۔ کہدو کہ ڈیوڑھی سے چلا
جائے۔ ورنہ اسی آگ سے مُنہ جھلس دوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔

پنڈت جی نے انہیں سمجھا کر کہا۔ اندر آگیا تو کیا ہوا۔ تمہاری کوئی چیز تو نہیں
چھوئی۔ زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دیدیتیں۔ کام تو ہمارا ہی کر رہا
ہے۔ کوئی لکڑہارا یہی لکڑی پھاڑتا۔ تو کم از کم چار آنے لیتا۔

پنڈتانی نے گرج کر کہا۔ وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟

پنڈت نے ہار کر کہا۔ سُسرے کی بدقسمتی تھی اور کیا؟

پنڈتانی:۔ اچھا اس وقت تو آگ دئے دیتی ہوں۔ لیکن پھر جو اس طرح گھر
میں آئیگا۔ تو مُنہ ہی جھلس دوں گی۔

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بیچارہ پچھتا رہا تھا۔ کہ
ناحق آیا۔ سچ تو کہتی ہیں۔ پنڈت کے گھر چمار کیسے چلا آئے۔ یہ لوگ بڑے پاک
صاف ہوتے ہیں۔ تب ہی تو اتنا مان ہے۔ چمار چمار تھوڑے ہی ہیں۔ اسی گاؤں میں
بوڑھا ہو گیا۔ مگر مجھے اتنی اکل (عقل) بھی نہ آئی۔

اس لئے جب پنڈتانی جی آگ لیکر نکلیں۔ تو جیسے اُسے جنت مل گئی۔ دونوں
ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔ پنڈتانی ماتا! مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ کہ گھر
میں چلا آیا۔ چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری۔ اتنے مورکھ نہ ہوتے۔ تو سب کی
لات کیوں کھاتے۔

پنڈتانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ انہوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری دکھی کے سر پر پڑ گئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر سر کو جھاڑنے لگا۔ اس کے دل نے کہا یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے۔ بھگوان نے کتنی جلدی سزا دیدی۔ اسی لئے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے۔ اور سب کے روپیے مارے جاتے ہیں۔ برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے۔ گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل کر گرنے لگیں۔

باہر آکر اس نے چلم پی اور پھر کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پر آگ پڑ گئی۔ تو پنڈتانی کو اس پر کچھ رحم آگیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اٹھے۔ تو بولیں۔ اس چمرو کو بھی کچھ کھانے کو دے دو۔ بیچارہ کب سے کام کر رہا ہے۔ بھوکا ہوگا۔

پنڈت جی نے اس تجویز کو دنیا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔ روٹیاں ہیں

پنڈتانی:۔ دو چار بچ جائینگی۔

پنڈت:۔ دو چار روٹیوں سے کیا ہوگا۔؟ یہ چمار ہے۔ کم از کم سیر بھر چڑھا جائے گا۔

پنڈتانی:۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ارے باپ رے! سیر بھر!! تو پھر رہنے دو۔

پنڈت جی نے اب شیر بن کر کہا۔ کچھ بھوسی چوکر ہو۔ تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو۔ سالے کا پیٹ بھر جائیگا۔ پتلی روٹیوں سے ان کمبختوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ انہیں تو جوار کا موٹا سا ٹکر چاہیئے۔

پنڈتانی نے کہا۔ اب جانے بھی دو۔ دھوپ میں کون مرے!

(۳۷)

دُکھی نے چلم پی کر پھر کلہاڑی سنبھالی۔ دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آ گئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی گونڈ آ گیا۔ بولا۔ بوڑھے دادا! جان کیوں دیتے ہو۔ تمہارے پھاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی۔ ناحق ہلکان ہوتے ہو۔

دُکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا۔ "بھائی ابھی گاڑی بھر بھوسہ ڈھونا ہے۔

گونڈ: کچھ کھانے کو بھی دیا کام ہی کرانا جانتے ہیں۔ جا کے مانگتے کیوں نہیں؟

دُکھی: تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا بامھن کی روٹی ہم کو پچے گی"

گونڈ: پچنے کو تو پچ جائیگی۔ مگر ملے تو خود تو مونچھوں پر تاؤ دیکر کھانا کھایا اور آرام سے سو رہے ہیں۔ تمہارے لئے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگا دیا۔ زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ حاکم بھی بیگار لیتا ہے۔ تو تھوڑی بہت مزدوری دیدیتا ہے۔ یہ اُن سے بھی بڑھ گئے۔ اس پر دھرماتما بنتے ہیں۔

دُکھی نے کہا۔ بھائی آہستہ آہستہ بولو۔ کہیں سن لینگے۔ تو بس! یہ کہکر دُکھی پھر سنبھل پڑا۔ اور کلہاڑی ہلانے لگا۔

گونڈ: کو اُس پر رحم آ گیا۔ کلہاڑی ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا۔ لیکن گانٹھ میں ذرا سا نشان بھی نہ ہُوا۔ بالآخر اس نے کلہاڑی پھینک دی۔ اور یہ کہکر چلا گیا۔ کہ یہ تمہارے پھاڑے نہ پھٹے گی۔ خواہ تمہاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔

دُکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ انہوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی تھی۔ کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کرتا رہونگا۔ ابھی گھر پر سو کام پڑے

ہیں ۔ کام کاج والا گھر ہے ۔ ایک نہ ایک چیز گھٹی ہی رہتی ہے ۔ مگر انہیں اس کی
کیا فکر؟ چلوں جب تک بھوسہ ہی اٹھا لاؤں ۔ کہہ دونگا ۔ آج تو لکڑی نہیں پھٹی ۔ کل
آکر پھاڑ دونگا ۔

اس نے ٹوکرا اٹھایا ۔ اور بھوسہ ڈھونے لگا ۔ کھلیان یہاں سے دو فرلانگ
سے کم نہ تھا ۔ اگر ٹوکرا خوب بھر بھر کر لاتا ۔ تو کام جلد ختم ہو جاتا ۔ مگر سر پر اٹھاتا کون!
خود اس سے اُٹھ نہ سکتا تھا ۔ اس لئے تھوڑا تھوڑا لاتا تھا ۔ ۴ بجے کہیں بھوسہ ختم
ہؤا ۔ پنڈت جی کی نیند بھی کھلی ۔ مُنہ ہاتھ دھوئے ۔ پان کھایا ۔ اور باہر نکلے دیکھا ۔ تو
دُکھی ٹوکرے پر سر رکھے سو رہا ہے ۔ زور سے بولے ۔ ارے دکھیا تو سو رہا ہے ۔
لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہوئی ہے ۔ اتنی دیر تو کرتا کیا رہا ۔ مُٹھی بھر بھوسہ
اٹھانے میں شام کر دی ۔ اس پر سو رہا ہے ۔ کلہاڑی اُٹھا لے ۔ اور لکڑی پھاڑ ڈال
تجھ سے ذرا سی لکڑی بھی نہیں پھٹتی ۔ پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی ۔ میرا دوش مت
دینا ۔ اسی لئے تو کہتے ہیں ۔ کہ جہاں پنچ کے گھر کھانے کو ہؤا ۔ اسکی آنکھ بدل جاتی ہے

دُکھی نے پھر کلہاڑی اٹھائی ۔ جو باتیں پہلے سے سوچ رکھی تھیں ۔ وہ سب بھول
گیا ۔ پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا ۔ آج صبح ناشتہ تک نہ کیا تھا ۔ فرصت ہی نہ
ملی ۔ اُٹھنا بیٹھنا تک پہاڑ معلوم ہوتا تھا ۔ جی ڈوبا جاتا تھا ۔ پر دل کو سمجھا کر اُٹھا ۔ پنڈت
ہیں ۔ کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں ۔ تو پھر ستیاناس ہی ہو جائے ۔ جب ہی تو
ان کا دنیا میں اتنا مان ہے ۔ ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے ۔ جسے چاہے بنا
دیں ۔ جسے چاہیں بگاڑ دیں ۔ پنڈت جی گانٹھ کے پاس آکر کھڑے ہوگئے ۔ اور
حوصلہ افزائی کرنے لگے ۔ ہاں! مار کس کے ۔ اور مار ۔ کس کے مار ۔ ابے زور سے مار
تیرے ہاتھ میں تو جیسے دم ہی نہیں ہے ۔ لگا کس کے ۔ کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے
ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے ۔ دے اُسی سوراخ میں ۔

دُکھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ نہ معلوم کون سی غیبی طاقت اُس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی۔ تکان۔ بھوک۔ پیاس۔ کمزوری سب کی سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے قوتِ بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی۔ اور دُکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا۔ بھوکا۔ پیاسا۔ تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔

پنڈت جی نے پکارا۔ اُٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔ پتلی پتلی چیلیاں ہو جائیں۔ دُکھی نہ اُٹھا۔ پنڈت جی نے اب اسے دق کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اندر جا کر بوٹی چھانی۔ حاجات ضروری سے فارغ ہوئے نہایا۔ اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے۔ دُکھی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ زور سے پکارا۔ ارے دکھی کیا پڑے ہی رہو گے؟ چلو تمہارے ہی گھر چل رہا ہوں۔ سب سامان ٹھیک ہے نہ؟ دکھی پھر بھی نہ اُٹھا۔

اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوا۔ پاس جا کر دیکھا۔ تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ بدحواس ہو کر بھاگے۔ اور پنڈتانی سے بولے "دکھیا تو جیسے مر گیا۔"

پنڈتانی جی تعجب انگیز لہجہ میں بولیں۔ "ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا نہ!"

ہاں! لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا۔ اب کیا ہوگا۔

پنڈتانی نے مطمئن ہو کر کہا۔ "ہوگا کیا۔ چمروانے میں کہلا بھیجو۔ مردہ اٹھا لے جائیں"

دم کے دم میں یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے۔ صرف ایک گھر گونڈ کا تھا۔ لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ کنوئیں کا راستہ ادھر ہی سے تھا۔ پانی کیوں کر بھرا جائے۔ چمار کی لاش کے پاس سے ہو کر پانی بھرنے کون جائے

ایک بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا۔ اب مردہ کیوں نہیں اٹھواتے۔ کوئی گاؤں

میں پانی پیئے گا یا نہیں؟

ادھر گونڈے چمروں نے بیں جا کر سب سے کہہ دیا۔ خبردار! مردہ اُٹھانے مت جانا۔ ابھی پولیس کی تحقیقات ہوگی۔ دگی ہے۔ کہ ایک غریب کی جان لے لی۔ پنڈت ہونگے۔ تو اپنے گھر کے ہونگے۔ لاش اُٹھاؤگے۔ تو تم بھی پکڑے جاؤگے

اِس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے۔ پر چمروں ئی آدمی لاش اُٹھا لانے کو تیار نہ ہُوا۔ ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں اور پنڈت جی کے دروازے پر آکر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں۔ کوئی روتی تھی۔ کوئی سمجھاتی تھی۔ پر چمار ایک بھی نہ تھا۔ پنڈت جی ں کو بہت دھمکایا۔ سمجھایا منت کی۔ پر چماروں کے دل پر پولیس کا رعب چھایا ہوا تھا۔ ایک بھی نہ مِنکا۔ آخر نا امید ہو کر لوٹ آئے۔

(۴)

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہوگیا۔ مگر لاش اٹھانے کوئی چمار نہ آیا۔ اور برہمن چمار کی لاش کیسے اُٹھاتے۔ بھلا ایسا کسی شاستر پران میں لکھا ہے۔ کہیں کوئی دکھا دے۔

پنڈتانی نے جھنجلا کر کہا۔ ان ڈائنوں نے تو کھوپڑی چاٹ ڈالی۔ سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا۔

پنڈت نے کہا۔ چڑیلوں کو رونے دو۔ کب تک روئیں گی۔ جیتا تھا۔ تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ مرگیا۔ تو شور وغل مچانے کے لئے سب کی سب آپہنچیں

پنڈتانی۔ چماروں کا رونا منحوس ہے۔

پنڈت: "ہاں بہت منحوس"

پنڈتائی :- ابھی سے بو آنے لگی۔

پنڈت :- چمار تھا سُسرا کہ نہیں۔ ان سبھوں کو کمانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا۔

پنڈتائی :- ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی۔

پنڈت :- سب کے سب بھرشٹ ہیں۔

رات تو کسی طرح کٹی۔ مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی بد بو پھیلنے لگی۔

پنڈت جی نے ایک رسی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا۔ اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا۔ اور گاؤں کے باہر گھسیٹ لے گئے۔ وہاں سے آکر فوراً نہائے۔ دُرگا پاٹ پڑھا۔ اور گھر میں گنگا جل چھڑکا۔

ادھر دُکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ۔ گدھ اور کوّے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا

पुस्तकालय
منشی پریم چند کی نئی معرکۃ الآرا تصانیف
غبن
بالکل تازہ تصنیف جو کہ بے حد مقبول ہوئی ہے۔ جس میں سفید پوشوں کی مالی تر
اور ترغیبات کا خاکہ۔ رسم و رواج کی بیہودہ پابندیوں کا خطرناک انجام۔ اس کے
کے مطالعہ سے آپ کو عورت کی صحیح فطرت کا اندازہ ہوگا۔ اور آپ دیکھیں گے
عورت کو "صنف نازک" کی بجائے "صنف قوی" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ دو حصے
قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ)
پردہ مجاز
جس کو چھپے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ منشی صاحب کسی تعارف کے محتاج
نہیں۔ ان کی تصانیف نے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ اردو زبان میں ا
درجے کا دوسرا ناولسٹ نہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے مجاز کے پردے
ایک حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ دو حصوں میں قیمت سوا دو روپیہ (عہ)
تیرتھ رام ہرنس لال تاجران کتب چوک انارکلی لاہور
مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں پنڈت تیرتھ رام پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر چوک انارکلی لاہور
Signature with Date

ARYA BHATT - A Science Magazine is being published to popularise Science. This Magazine also contains articles of scholars from other Vishwavidyalayas. The Vedic Path and the Prahlad were being published in English and Hindi respectively. These magazines contain research material for students of Vedic Literature, Religion, Philosophy, Culture and Ancient India History, etc. From this year, a Science Research Magazine is going to be published; it is believed that it will gain international repute right from the beginning.

THE GURUKULA PATRIKA - is the oldest magazine of this Vishwavidyalaya; it highlights the original values of Gurukula. Besides scholars, persons who have faith in Arya Samaj, are the voracious readers of this magazine.

Publication grants were sanctioned to the following teachers of the Vishwavidyalaya:-

تھرام ہربنس لال پبلشرز تاجران
چوک انارکلی - لاہور